صاحب ''تدبرقرآن'' کی یاد میں

''تدبرقرآن'' کے بعد فہم قرآن کی دنیا وہ نہیں رہی جواس سے پہلے تھی۔ آج ہم تفسیر کے عہداصلاحی میں جی رہے ہیں۔

پندرہ برس پہلے دسمبر کی یہی پندرہ تاریخ تھی، جب صاحب تدبرقرآن مولانا امین احسن اصلاحی دنیا سے رخصت ہوئے۔ یہ دن آیا تو میں نے مولانا کو یاد کیا۔ علم وفکر کی دنیا میں ایک مدت سے خزاں کا راج ہے۔ اس بے کیفی نے مولانا کی کمی کا احساس بڑھا دیا:

دیکھا بھی دکھایا بھی، سنایا بھی سنا بھی
ہے دل کی تسلی نہ نظر میں، نہ خبر میں!

تئیس برس ہوتے ہیں جب میں نے پہلی مرتبہ مولانا کو دیکھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نے دبستان فراہی کی دہلیز پر پہلا قدم رکھا تھا۔ ایک طفل مکتب کیا جانے کہ فراہی کون ہیں اور اصلاحی کون۔ تاہم یہ احساس مجھے اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا کہ میں صاحب تدبرقرآن کے حضور میں ہوں۔ میں نے اپنے جلیل القدر استاذ جاوید احمد صاحب غامدی کو دیکھا کہ تلمیذانہ عجز کے ساتھ ان کے درس میں شریک ہیں تو ان کی عظمت کا احساس مزید گہرا ہو گیا۔ تئیس برس سے اس دبستان کی دہلیز ہی پر کھڑا ہوں۔ اپنی کوتاہ نگاہی کا اعتراف ہے کہ میں اسے پار نہ کر سکا۔ لیکن ان برسوں میں یہ ضرور جان لیا کہ علوم اسلامی کے دور ثانی کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے:

کہاں ہم اور کہاں یہ نکہتِ گل
نسیم صبح، تیری مہربانی

برسوں پہلے امام فراہی دنیا سے رخصت ہوئے تو سید سلیمان ندوی نے نوحہ لکھا ''الصلوٰۃ علیٰ ترجمان القرآن''۔

یہ امام ہی تھے جنھوں نے متنبہ کیا کہ عہد رسالت اور دور صحابہ سے دوری کیا ہوئی کہ قرآن مجید ہمارے لیے قول فیصل نہیں رہا۔ آیات الٰہی پر کہیں روایات کی حکومت ہے اور کہیں اقوال کی۔ امام نے خبردار کیا کہ ہم نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ ترتیب کو الٹ دیا۔ قدیم ترتیب کو ازسرنو زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ قرآن مجید کو روایت کی روشنی میں نہیں، روایت کو قرآن کی روشنی میں سمجھا جائے گا۔ قول فقیہ کو حاکم مان کر آیت کی تاویل نہیں ہو گی، آیت الٰہی کو حاکم مان کر اقوال کے رد و قبولیت کا فیصلہ ہو گا۔ یہاں سوال اٹھا کہ خود قرآن مجید کو کیسے سمجھا جائے گا۔ امام فراہی نے اس کا جواب دیا: ''ایک دیا جلایا اور مولانا اصلاحی نے اسے ایک شعلۂ جوالہ بنا دیا''۔ انھوں نے بتایا کہ قرآن مجید کی زبان، اس کے فہم کی شاہ کلید ہے۔ قرآن محض عربی میں نہیں اترا، یہ ام القریٰ کی زبان میں نازل ہوا۔ یہ وہ زبان ہے جس کے شاہ کار امراء القیس اور لبید جیسے شعرا کے کلام میں موجود تھے۔ قرآن اترا تو وہ زبان و بیان کا معجزہ تھا۔ زبان تو وہی تھی لیکن اس نے لبید کو بے زبان بنا دیا۔ اسلام کی دولت نصیب ہوئی تو پھر شعر نہیں کہا۔ وجہ پوچھی گئی تو یہی کہہ سکے: 'أبعد القرآن ؟' کیا قرآن کے بعد بھی کچھ کہنے کی گنجایش ہے؟ امام فراہی نے صدا لگائی کہ ام القریٰ کی اس زبان سے واقفیت کے بغیر فہم قرآن کا باب نہیں کھل سکتا۔ امام نے ایک اور بات بھی کہی۔ اس امت کا اجماع ہے کہ قرآن مجید کی ترتیب توقیفی ہے۔ یہ کسی کا اجتہاد نہیں، یہ اللہ کا حکم ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ قرآن اس ترتیب سے نازل نہیں ہوا، جس ترتیب کے ساتھ آج ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ اس کی ترتیب نو ہوئی اور قرآن مجید کی نص ہے کہ اللہ کے حکم سے ہوئی۔ عجیب بات یہ ہے کہ تفسیر قرآن کی روایت میں اتنی اہم بات کو نظر انداز کیا گیا۔ اسے متفرق اقوال زریں کا مجموعہ سمجھ کر اس کی تفسیر کی گئی۔ کبھی اس کی آیات کو شان نزول کی روایات کے تابع کر دیا گیا اور کبھی فقہ و کلام کے۔ امام فراہی نے متوجہ کیا کہ قرآن مجید ایک مرتب کتاب ہے اور اس کے نظم کو جانے بغیر اس کے معانی تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ نظم قرآن فہم قرآن کی بنیاد ہے۔

امام فراہی نے اصول مرتب کیے، لیکن وہ قرآن مجید کی چند آخری سورتوں ہی کی تفسیر لکھ پائے تھے کہ سفر آخرت پر چل نکلے۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنے استاذ کی انگلی تھامی اور ان اصولوں کی راہنمائی میں ''تدبر قرآن'' جیسا شاہ کار تخلیق کر دیا۔ ان کی آرا سے اختلاف کا امکان ہر وقت موجود ہے، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ''تدبر قرآن'' تفسیر کی دنیا میں ایک نئی آواز ہے۔ بالیقین اس تفسیر کے بعد علوم اسلامی کے مباحث بدل گئے ہیں۔

قرآن مجید کی زبان اور نظم کو بنیاد ماننے کے بعد ہم جب قرآن مجید کا مطالعہ کرتے ہیں تو حیرت کا ایک باب کھل جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید انگلی پکڑ کر ہمیں غلط فہمیوں کی وادی سے سرخرو نکال لے جاتا ہے۔ اب روایات کی تفہیم اور تطبیق بھی آسان ہو گئی ہے اور قول فقیہ کی حقیقت بھی۔ اب انکار حدیث کی ضرورت ہے نہ اس روایت کے

استخفاف کی، جو ہمارے اکابرین کی عطا ہے۔ ایک مختصر شذرہ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا، ورنہ میں مثالوں سے واضح کرتا کہ کتاب اللہ کی آیات کو جب قرآن کی زبان اور نظم قرآن کی روشنی میں سمجھا جائے تو کیا مفہوم سامنے آتا ہے اور اگر اسے روایات اور اقوال کے تابع کر دیا جائے تو پھر کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ تیئس سال پہلے اللہ نے کرم کیا اور میں نے اس وادی میں قدم رکھا۔ نتیجہ یہ ہے کہ پھر فہم قرآن کے باب میں کسی اور کی احتیاج نہیں رہی۔

مولانا اصلاحی ہماری اس روایت کے بھی امین تھے جب حسن کردار اور علم دین ہم رکاب ہوتے تھے۔ دولت، شہرت اور اقتدار، آج جن جن آستانوں پر جبہ و دستار نیلام ہوتے ہیں، مولانا کے نزدیک ان کی حیثیت پرکاہ سے زیادہ نہ تھی۔ ''تدبر قرآن'' مکمل ہوئی تو ایک نامور صحافی حاضر ہوئے اور کہا کہ وہ اس کی تقریب رونمائی کا اہتمام کرنا چاہتے ہیں۔ رضا مند نہیں ہوئے۔ کہا اس میں اگر کوئی خیر ہے تو اپنی جگہ بنائے گی۔ اگر نہیں تو رونمائی کس کام کی۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے طویل رفاقت رہی جو برقرار نہ رہ سکی۔ دونوں بزرگوں نے ایک دوسرے سے اختلاف کیا۔ شکر رنجی کے اس دور میں ایک دوسرے کے نام خطوط لکھے۔ ان سے دونوں کا موقف معلوم ہوتا ہے۔ میرے جیسا طالب علم پڑھتا ہے تو نفس مضمون کو بھول کر حسن تحریر میں کھو جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا ایک بڑے ادیب تھے۔ بلاشبہ یہ دبستان شبلی ہی کا امتیاز ہے کہ علم و ادب ہم رکاب رہتے ہیں۔ مولانا اسی گلستان کے سرسبد تھے۔

علم و فضل کے اس زوال میں مولانا بہت یاد آتے ہیں۔ لوگ علم کے نام پر جب سنگ ریزوں کو جواہر بنا کر پیش کرتے ہیں تو اس بے توفیقی پر دل تاسف سے بھر جاتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ان کے سامنے ''تدبر قرآن'' رکھوں اور یہ عرض کروں:

دست ہر نا اہل بیمارت کند
سوئے مادر آ کہ تیمارت کند

—— خورشید احمد ندیم

اہل دنیا کو یہ معلوم نہیں کہ امین احسن...

ممتاز صحافی اور دانش ور ارشاد احمد حقانی مرحوم نے اپنے ایک کالم ''آہ! الطاف گوہر'' میں گوہر صاحب کی وفات کے حوالے سے لکھا تھا:

''آخری سے پہلی ملاقات میں جب ابھی ان کے اندر قدرے طویل گفتگو کرنے کی توانائی موجود تھی، مجھے کہنے لگے: سورۂ بقرہ کی دوسری آیت میں 'ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ 'میں 'ذٰلِكَ' کے مفہوم پر میرا ذہن پوری طرح صاف نہیں تھا۔ میں نے مختلف تفاسیر دیکھیں، لیکن جو رہنمائی مجھے مولانا امین اصلاحی کی ''تدبر قرآن'' سے ملی، اس کا جواب نہیں۔''

حقانی صاحب مزید لکھتے ہیں:

''تدبر قرآن'' کا مطالعہ کرنے کا مشورہ میں نے انھیں دیا تھا۔ افسوس کہ اپنی صحت کی حالت کی وجہ سے وہ قرآنی علوم کے اس خزانے سے حسب خواہش استفادہ نہ کر سکے، لیکن انھیں اس کی قدر و قیمت کا اچھی طرح احساس ہو گیا تھا۔''

(جنگ ۱۶ نومبر ۲۰۰۰)

الطاف گوہر مرحوم نے انتہائی بھرپور طویل عوامی اور سرکاری زندگی گزاری تھی۔ آپ صدر ایوب خان کے سیکرٹری انفارمیشن رہے۔ مشہور دانش ور، شاعر، ادیب، صحافی، مترجم، براڈ کاسٹر اور متجسس طالب علم تھے، دینی علوم کی طرف خاص رجحان تھا، دین پر لیکچرز دیا کرتے تھے، لیکن افسوس وہ اصل امین احسن اصلاحی سے ناواقف تھے۔ جب امین احسن کے بارے میں اخص الخواص کی بے خبری کا یہ عالم ہو تو خواص اور عوام کی ناواقفیت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

علم و شعور و آگہی کی آبرو کہاں
سب مٹ گئی ہے کشمکش انقلاب میں

۱۹۲۵ء میں امام حمید الدین فراہی کی شاگردی میں آنے کے بعد اصلاحی صاحب کا یہ معمول رہا کہ صبح ۳ بجے بیدار ہوتے، نماز تہجد ادا کرتے اور پھر قرآن مجید پر تدبر کیا کرتے تھے...... تین برس سخت بیمار رہنے کے بعد ۱۵ دسمبر ۱۹۹۷ء کی صبح تین بجے ہی وہ اپنے محبوب حقیقی سے جا ملے تھے۔

صاحب ''تدبر قرآن'' ہماری قوم بلکہ بنی نوع انسان کے عظیم محسن تھے۔ لیکن پچھلے دنوں ۱۵ دسمبر آیا اور خاموشی سے گزر گیا۔ افسوس کھلاڑیوں اور اداکاروں کے سحر میں مبتلا اور سیاست دانوں کے غیر مہذب مباحثوں کی شکار اور اپنے عارضی اور ابدی مستقبل سے بے گانہ کس قدر سطح بین ہے یہ دنیا۔

قرآن کو ایصال ثواب اور حصول ثواب تک محدود کرنے والے اہل دنیا کو شاید یہ معلوم نہیں کہ قرآن کو اگر حصول ہدایت کا ذریعہ بنانا ہے تو تفسیر امین احسن ''تدبر قرآن'' پر تدبر کرنا ہو گا۔ دین کو اگر دلیل اور تہذیب کے ساتھ لوگوں کے عقل و قلب میں اتارنا ہے تو تالیف امین احسن ''دعوت دین اور اس کا طریق کار'' کا مطالعہ کرنا ہو گا۔ دین کو محض ریاست کا نظام سمجھنے والے اہل ظاہر نے اگر دین کو اس کی حقیقت اور وسعت کے ساتھ سیکھنا ہے تو تحقیق امین احسن

’’تزکیۂ نفس‘‘ پر غور کرنا ہوگا۔

شاید اہل دنیا کو یہ معلوم نہیں کہ امین احسن سے ناواقفیت درحقیقت، فہم اسلام کے صحیح تر راستے، نبیوں کے اک سچے جانشیں اور دنیاے علم کے ایک امام سے ناواقفیت ہے۔ امین احسن نے دینی علوم وفنون میں تحقیق وجستجو، تعلیم و تربیت، تصنیف وتالیف اور تحریر وتقریر کا کام جس جرأت و بے باکی، صبر وثبات، انا وخودداری اور لطافت ونفاست کے ساتھ کیا ہے اس کی مثال تلاش کرنا مشکل ہے۔ وہ اپنی کارکردگی میں انتہائی کامیاب رہے ہیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بدقسمت قوم ان سے پوری طرح فائدہ اٹھانے میں تاحال ناکام ہی رہی ہے۔ وہ تو قوم کو اللہ کے کلام کے ساتھ ہم کلام کرنا چاہتے ہیں، اس کا تعلق اللہ کے ساتھ براہ راست قائم کر کے اسے غیر اللہ کی غلامی سے نجات دلانا چاہتے ہیں۔ وہ تو تقلید وجمود کی کال کوٹھری میں جکڑی ہوئی قوم کو دلیل وبرہان کی روشن، وسیع اور خوش گوار فضا میں لانا چاہتے ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے جب امین احسن بقید حیات تھے وہ یہ شکر وشکایت ضرور کرتے ہوں گے:

تاثیر ہے یہ میرے نفس کی کہ خزاں میں مرغانِ سحر خواں میری صحبت میں ہیں خورسند
لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند!

—— محمد بلال

قیامت تو روزانہ آ رہی ہے!

۲۱ دسمبر ۲۰۱۲ کو جمعہ کے دن ایک سیارہ زمین کی سطح کے ساتھ ٹکرائے گا، جس سے انتہائی بھیانک آواز پیدا ہوگی، پھر ایسی تباہی وبربادی شروع ہوگی کہ زمین سے انسانی زندگی کا وجود ختم ہو جائے گا۔ انٹرنیٹ پر اس خبر پر مبنی Animations کو کروڑوں کی تعداد میں لوگوں نے دیکھا اور پریشانی کا اظہار کیا۔ اہل مغرب کا اعصابی تناؤ سب سے بڑھ کر رہا۔ ہالی وڈ نے اس موضوع پر خطیر سرمایے سے ایک فلم بنا ڈالی جو پوری دنیا میں بڑی دلچسپی کے ساتھ دیکھی گئی جس کی پاکستان میں بھی نمائش ہوئی تھی اور جسے اردو میں ڈب کر کے ایک ٹی وی چینل نے بھی نشر کر دیا تھا۔ اس طرح لوگوں میں یہ بحث پوری سنجیدگی کے ساتھ چھڑ گئی کہ کیا قیامت اس طرح کے کسی حادثے کے نتیجے میں آئے گی؟ صورت حال اس حد تک سنگین ہوگئی کہ اس معاملے میں امریکی خلائی ادارے ناسا کو مداخلت کرنی پڑی اور اس

نے اس خبر اور فلم کو ایک افسانہ قرار دے کر مسترد کر دیا۔

۲۱ دسمبر ۲۰۱۲ کو دنیا کا خاتمہ۔ یہ عقیدہ ایک قدیم تہذیب مایا کے ماننے والوں کا ہے۔ یہ تہذیب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدایش سے بہت پہلے اس دنیا میں موجود تھی۔ یہ لوگ زبان، حساب اور ستاروں کے علم میں بہت ترقی یافتہ تھے۔ ان کی تہذیبی برتری نے گرد و پیش کی اقوام کو بھی متاثر کیا تھا۔

مایا تہذیب کا عقیدہ ایک طرف رکھتے ہیں۔ مگر اس حقیقت سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا عارضی طور پر بنائی ہے اور ایک دن قیامت برپا ہو گی، جزا و سزا کے بعد ابدی زندگی شروع ہو گی جو کہ اس زمین و آسمان کے تباہ ہونے کے بعد شروع ہو گی۔ یہ عقل اور عدل پر مبنی تصور قرآن مجید میں مختلف مقامات پر بیان ہوا ہے:

''(یہ اس دن کو یاد رکھیں) جب زمین ہلا دی جائے گی، جس طرح اسے ہلانا ہے، اور زمین اپنے سب بوجھ نکال کر باہر ڈال دے گی۔ اور انسان کہے گا: اس کو کیا ہوا۔'' (الزلزال ۹۹: ۱-۳)

''(اُس دن کو یاد رکھو)، جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی۔ اور سب اللہ، واحد و قہار کے حضور میں پیش ہوں گے۔'' (ابراہیم ۱۴: ۴۸)

وہ منظر مایا تہذیب کے اندازے سے کہیں زیادہ ہولناک ہو گا۔ اس وقت آسمان پھٹ جائے گا۔ سورج اور چاند اکٹھے کر دیے جائیں گے۔ تارے بکھر جائیں گے۔ سمندر پھوٹ بہیں گے۔ پہاڑ اڑا دیئے جائیں گے۔ قبریں کھول دی جائیں گی۔ صرف تباہی ہی نہیں ہو گی، احتساب بھی ہو گا۔ کڑا احتساب۔ تمام مرے ہوئے انسانوں کی ہڈیوں کو جمع کر کے اور ان کی پور پور کو درست کر دیا جائے گا۔ جب کوئی سفارش چلے گی اور نہ رشوت۔ جھوٹی گواہی کا کوئی امکان ہو گا اور نہ تعلقات ہی کام آئیں گے۔

''کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ یونہی چھوڑ دیا جائے گا۔'' (القیامہ: ۳۶)

''نہ کسی کی دوستی کام آئے گی اور نہ کسی کی سفارش نفع پہنچائے گی۔'' (البقرہ: ۲۵۴)

قرآن و حدیث میں مذکور قرب قیامت کی بہت سی نشانیاں ظاہر ہو چکی ہیں۔ اور کچھ کا ظہور ابھی باقی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کا معاملہ اتنا قریب بھی نہیں ہے۔ لیکن ایک حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ موت کی آمد کا سلسلہ تو شب و روز جاری ہے۔ وہ آنے سے پہلے اجازت نہیں لیتی۔ وہ تو اچانک آ جاتی ہے۔ وہ سب کے بوڑھا ہونے کا انتظار نہیں کرتی۔ وہ نوجوانوں کو بھی اچانک دبوچ لیتی ہے حتیٰ کہ ماں کے پیٹ کے اندر نشو و نما پانے والے بچے کو دنیا میں آنکھ کھولنے سے قبل ہی آ لیتی ہے۔ روزانہ ہماری نیند اور پھر نیند سے بیداری بھی تو موت اور موت کے بعد

اٹھائے جانے کی تذکیر کر رہی ہے۔سورۂ زمر میں ہے:

''اللہ ہی روحوں کو ان کی موت کے وقت اور جن کی موت نہیں آئی، انھیں نیند کے وقت سوتے میں، پھر جن پر موت کا حکم کر چکتا ہے، ان کو روک رکھتا ہے اور باقی روحوں کو ایک وقت مقرر تک کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ جو لوگ فکر کرتے ہیں ان کے لیے اس میں نشانیاں ہیں۔'' (آیت:۴۲)

سونے اور جاگنے کی دعا ہی پر غور کریں:

''اے اللہ میں آپ کا نام لے کر مرتا (سوتا) ہوں اور زندہ ہوتا (جاگتا) ہوں۔''

''تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جس نے ہمیں مار کر زندگی بخشی اور ہم کو اسی کی طرف قبروں سے اٹھ کر جانا ہے۔''

سچ تو یہ ہے کہ:

سرخ لوہے پر قطرہ پانی کا
یہ حقیقت ہے زندگانی کی

اس حقیقت کو سبھی مانتے ہیں۔مگر مان کر بھول جاتے ہیں۔ وہ اپنے دل ویران کر لیتے ہیں۔اور دھوکہ دہی، عہد شکنی، سود خوری، امانت میں خیانت، تکبر، غیبت، کرپشن، قتل و غارت گری، غرض یہ کہ ہر برے کام میں ملوث ہو جاتے ہیں۔کاش اعلیٰ حقائق سے بے اعتنائی برتنے والے ہمارے پرانے اور نئے ابھرنے والے لیڈروں کو بھی کوئی سمجھائے کہ ملکی حالات کے مسئلے کی جڑ بنیاد کیا ہے۔مسائل کا اصل منبع کہاں ہے۔مسئلہ وہ دلائل ہیں جن کی بنیاد پر لوگ اپنے ضمیر کے روبرو شرارت کرتے ہیں۔مسئلہ نظام کی تبدیلی نہیں، دلوں کی تبدیلی کا ہے۔مسئلہ ہماری جلد پر ابھرنے والے نشانات نہیں، دل کی بیماری ہے۔علاج بیماری کا کریں، مرض کی علامات کا نہیں۔اور دلوں میں تبدیلی کیسے آتی ہے، اس کا جواب بھی دلوں کے حال کو جاننے والے نے دے رکھا ہے۔اپنی قائدانہ صلاحیتوں کا رخ ادھر کر کے بھی دیکھیں۔

یارب:

پیدا دل ویراں میں پھر شورش محشر کر
اس شہر کے خوگر کو پھر وسعت صحرا دے

قیامت کب آئے گی، اس کا علم اللہ کے پاس ہے، لیکن جس کی موت واقع ہوتی ہے، اس کی قیامت تو آ جاتی

ہے۔اس کے سامنے سے تو غیب کے پردے ہٹ جاتے ہیں۔اس کی جزا اور سزا کا معاملہ تو ایک خاص انداز میں شروع ہو جاتا ہے۔قرآن کی رو سے:

''تو اس وقت کیا ہوگا جب فرشتے ان کے مونہوں اور پیٹھوں پر مارتے ہوئے ان کی روحیں قبض کریں گے۔''

(سورۂ محمد: ۲۷)

''ان کو جن کو فرشتے پاکیزہ حالت میں وفات دیتے ہیں۔وہ کہتے ہیں آپ لوگوں پر سلامتی ہو! داخل ہو جایئے جنت میں، اپنے اعمال کے صلہ میں۔'' (النحل ۳۲)

موت کو یاد رکھنے میں زندگی ہے۔فرد کی بھی، قوم کی بھی۔دنیا کی بھی، آخرت کی بھی۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی موت کو یاد رکھنے کی نصیحت فرمائی اور قبرستان میں تواتر سے جانے کی ہدایت فرمائی ہے۔

موت روزانہ آ رہی ہے، تو انفرادی سطح پر قیامت بھی روزانہ برپا ہو رہی ہے۔حضرت انسان کا معاملہ یہ ہے کہ اسے آج بتایا جائے کہ اگلے ہفتے تم امریکا جانے والے ہو تو وہ بڑی سرگرمی کے ساتھ اس ملک کے لحاظ سے تیاری شروع کر دیتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے جہاں میں جانے والا ہے، اور اس سفر کا آغاز کسی وقت بھی ہو سکتا ہے مگر اسے اس کی تیاری کی کوئی فکر نہیں!

افسوس:

اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ! اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

—— محمد بلال

''ایمان اور اسلام کے متعلق یہ بات بھی یاد رکھیے کہ یہ جامد اور غیر نامی نہیں، بلکہ ان میں دم بدم اضافہ ہوتا رہتا ہے اگر ان کی پرورش و پرداخت کی جائے اور یہ مضمحل، بلکہ مردہ اور بے جان ہو جاتے ہیں اگر ان کی دیکھ بھال نہ کی جائے۔دنیا کی دوسری نامی اور ذی حس چیزوں میں قدرت کا جو قانون جاری ہے وہی قانون ان میں بھی کارفرما ہے۔'' (''تزکیۂ نفس'' از مولانا امین احسن اصلاحی ۱۸/۲)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ التوبہ

(۱)

بَرَآءَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖٓ اِلَی الَّذِیْنَ عٰھَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ ﴿۱﴾ فَسِیْحُوْا
فِی الْاَرْضِ اَرْبَعَۃَ اَشْھُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّکُمْ غَیْرُ مُعْجِزِی اللّٰہِ وَاَنَّ اللّٰہَ مُخْزِی

———۲———

اللہ [۱۲۵] اور اُس کے رسول کی طرف سے اُن مشرکوں کے لیے اعلان براءت ہے جن سے تم نے
معاہدے کیے تھے۔[۱۲۶] سو[۱۲۷] (اے مشرکین عرب)، اب ملک میں چار مہینے اور چل پھر لو اور جان رکھو کہ تم

۱۲۵؎ اِس سورہ کی ابتدا میں 'بسم اللہ الرحمٰن الرحیم' نہیں لکھی جاتی۔ اِس کی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ سورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبین پر اُس عذاب کا اعلان کیا گیا ہے جو پیغمبروں کی تکذیب کے نتیجے میں اُن کے منکرین پر لازماً آتا ہے۔ خدا کی زمین پر یہ اُس کی آخری دینونت کی سرگذشت ہے جس میں مشرکین کے قتل عام اور اہل کتاب کو محکوم بنا لینے کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ سورہ کی ابتدا جن الفاظ سے ہوئی ہے، اُن کے ساتھ کسی طرح موزوں نہیں تھا کہ خدا کی رحمت و شفقت کا حوالہ دیا جائے۔ یہ خدا کے جلال اور قہر و غضب کے ظہور کا موقع ہے، اِس لیے 'بسم اللہ الرحمٰن الرحیم' سے ابتدا نہیں کی گئی۔

۱۲۶؎ دنیا میں انسان کو رہنے بسنے کا جو موقع دیا گیا ہے، وہ کسی حق کی بنیاد پر نہیں ہے، بلکہ محض امتحان کے لیے ہے۔ پیغمبروں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد یہ امتحان پورا ہو جاتا ہے تو یہ ضرورت بھی اِس کے ساتھ ہی ختم ہو

الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲﴾ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَرَسُوْلُهٗ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ

اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اور یہ بھی کہ اللہ (اپنے پیغمبر کا) انکار کرنے والوں کو رسوا کر کے رہے گا۔[۱۲۸] (پھر حج کا موقع آئے تو اِس سرزمین کے) سب لوگوں تک پہنچانے کے لیے بڑے حج کے دن[۱۲۹] اللہ اور اُس کے رسول کی طرف سے اعلان عام کر دیا جائے کہ اللہ مشرکوں سے بری الذمہ ہے اور اُس کا رسول بھی۔[۱۳۰] اب اگر تم لوگ توبہ کر لو تو تمھارے حق میں بہتر ہے اور اگر منہ پھیرو گے تو جان لو کہ تم اللہ سے

جاتی ہے کہ اُنھیں باقی رکھا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبین اب اِسی مقام پر پہنچ چکے تھے۔ چنانچہ آگے جس قتل عام کا حکم دیا گیا ہے، وہ خدا کی اِس سنت کا ظہور ہے کہ رسولوں کے مخاطبین اُن کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اِسی دنیا میں عذاب سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ اِس عذاب کا فیصلہ بھی خدا کرتا ہے اور جن پر یہ نازل کیا جاتا ہے، وہ بھی خدا کی طرف سے متعین کر کے بتا دیے جاتے ہیں۔ کوئی شخص، یہاں تک کہ خدا کا پیغمبر بھی اپنی طرف سے اِس کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ سورۂ توبہ اِسی فیصلے کا اعلان ہے۔ تاہم اخلاقی لحاظ سے ضروری تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن لوگوں کے ساتھ تبلیغ و دعوت اور اتمام حجت کی مصلحت سے معاہدے کر رکھے ہیں، کسی اقدام سے پہلے اُنھیں ختم کر دیا جائے۔ یہ اُنھی معاہدات سے براءت کی گئی ہے۔ آیت میں لفظ 'بَرَآءَ ةٌ' کے بعد 'اِلٰی' ہے۔ یہ اِس بات کی دلیل ہے کہ یہاں 'ابلاغ' کا مفہوم بھی مضمر ہے۔ یعنی اِس دست برداری کی اطلاع اُن تک پہنچا دی جائے۔

۱۲۷؎ یہاں سے خطاب میں تبدیلی ہوئی ہے اور اُس کا رخ براہ راست مشرکین کی طرف ہو گیا ہے۔ یہ تبدیلی بتا رہی ہے کہ اِس دھمکی کو معمولی نہ سمجھا جائے۔ یہ ایک فیصلہ کن دھمکی ہے جس کے نتائج اب پوری قطعیت کے ساتھ سامنے آنے والے ہیں۔

۱۲۸؎ عذاب سے پہلے چار ماہ کی یہ مہلت کب دی گئی؟ اِس کی کوئی حتمی تاریخ تو متعین نہیں کی جا سکتی۔ تاہم آگے کی آیتوں سے اتنی بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ اُس وقت دی گئی، جب قریش کی طرف سے معاہدۂ حدیبیہ کی کوئی خلاف ورزی ابھی نہیں ہوئی تھی۔

۱۲۹؎ اِس سے مراد حج ہی ہے۔ اہل عرب عمرے کو حج اصغر اور اِس کے مقابلے میں حج کو حج اکبر کہتے تھے۔

مِّنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ثُمَّ لَمۡ يَنۡقُصُوۡكُمۡ شَيۡـًٔا وَّلَمۡ يُظَاهِرُوۡا عَلَيۡكُمۡ اَحَدًا فَاَتِمُّوۡۤا اِلَيۡهِمۡ
عَهۡدَهُمۡ اِلٰى مُدَّتِهِمۡ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۴﴾ فَاِذَا انۡسَلَخَ الۡاَشۡهُرُ الۡحُرُمُ

بھاگ نہیں سکتے۔ (اے پیغمبر)، اِن منکروں کو دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو۔ وہ مشرکین، البتہ (اِس اعلان براءت سے) مستثنیٰ ہیں جن سے تم نے معاہدہ کیا، پھر اُس کو پورا کرنے میں اُنھوں نے تمھارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمھارے خلاف کسی کی مدد کی ہے۔ سو اُن کا معاہدہ اُن کی مدت تک پورا کرو، اِس لیے کہ اللہ اُن لوگوں کو پسند کرتا ہے جو (بدعہدی سے) بچنے والے ہوں۔[۱۳۱] (بڑے حج کے

۱۳۰؎ مطلب یہ ہے کہ چار ماہ کی جو مہلت اوپر دی گئی ہے، اُس کے گزر جانے کے بعد اُن لوگوں کی دارو گیر شروع کر دی جائے جن تک اعلان براءت کی اطلاع پہنچانا ممکن ہو۔ اِس کے بعد حج کے دن کا انتظار کیا جائے۔ اِس میں ملک کے کونے کونے سے لوگ جمع ہوں گے جن کی وساطت سے یہ اطلاع سر زمین عرب کے باقی سب لوگوں تک بھی پہنچا دی جائے کہ اللہ و رسول نے مشرکین سے براءت کا اعلان کر دیا ہے۔ خدا کی طرف سے جو مہلت اُنھیں ملی ہوئی تھی، اُس کی مدت پوری ہو گئی ہے۔ وہ اب عذاب کی زد میں ہیں۔ چنانچہ تمام معاہدات ختم کر دیے گئے ہیں اور آیندہ بھی اُن کے ساتھ کسی معاہدے کا امکان باقی نہیں رہا۔ اِس میں ضمناً یہ بشارت بھی ہے کہ عنقریب وہ موقع آنے والا ہے، جب مسلمان حج بھی کریں گے اور منکرین پر ایسا غلبہ بھی حاصل کر لیں گے کہ حج کے موقع پر اِس طرح کا اعلان کر سکیں۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان ۹ ھجری میں اِس حج سے سعادت اندوز ہوئے۔ یہ حج سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امارت میں کیا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق علی رضی اللہ عنہ نے قرآن کی یہ آیتیں لوگوں کو پڑھ کر سنائیں جس سے پورے عرب کے مشرکین تک اطلاع پہنچانے کا اہتمام کر دیا گیا۔*

۱۳۱؎ یہ اُن معاہدوں کا بیان ہے جو مذکورہ اعلان سے مستثنیٰ تھے۔ مدعا یہ ہے کہ غیر موقت معاہدے تو مہلت کی مدت گزر جانے کے فوراً بعد ختم ہو جائیں گے۔ اِسی طرح وہ معاہدے بھی ختم ہو جائیں گے جو اگرچہ موقت تھے، مگر فریق ثانی کی طرف سے اُن کی خلاف ورزی ہو چکی ہے۔ لیکن ایسے موقت معاہدے جن کی کوئی خلاف ورزی نہیں ہوئی، اُنھیں ختم نہیں کیا جائے گا، بلکہ قرار دادہ مدت تک برقرار رکھا جائے گا۔ مدت گزر جانے کے بعد، البتہ وہ بھی

* تفسیر القرآن العظیم، ابن کثیر ۲/ ۳۳۶۔

فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ
كُلَّ مَرْصَدٍ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵﴾ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ

دن) اِس (اعلان) کے بعد جب حرام مہینے گزر جائیں[۱۳۲] تو اِن مشرکوں کو جہاں پاؤ، قتل کرو اور (اِس مقصد کے لیے) اِن کو پکڑو، اِن کو گھیرو اور ہر گھات کی جگہ اِن کی تاک میں بیٹھو۔[۱۳۳] پھر اگر یہ توبہ کر لیں اور نماز کا اہتمام کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو اِن کی راہ چھوڑ دو۔[۱۳۴] یقیناً اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ اور اگر (اِس دارو گیر کے موقع پر) اِن مشرکوں میں سے کوئی شخص تم سے امان چاہے (کہ وہ

کالعدم ہوں گے اور جن مشرکین سے کیے گئے تھے، اُن کی دارو گیر بھی اُسی طرح شروع ہو جائے گی، جس طرح حکم دیا گیا ہے۔

۱۳۲؎ اِس سے وہ چار مہینے مراد نہیں ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے، بلکہ وہی مہینے مراد ہیں جنھیں اصطلاح میں اشہر حرم کہا جاتا ہے۔ یہ تعبیر اِن مہینوں کے لیے بطور اسم وعلم استعمال ہوتی ہے، اِس لیے عربیت کی رو سے کوئی اور مہینے مراد نہیں لیے جا سکتے۔ حج اکبر کے موقع پر جس اعلان کے لیے کہا گیا ہے، اُس کے بعد ۲۰ دن ذوالحجہ اور ۳۰ محرم کے باقی ہوں گے۔ یہ اُنھی کے بارے میں فرمایا ہے کہ اِن دنوں میں چونکہ جنگ وجدال ممنوع ہے، اِس لیے یہ جب گزر جائیں تو اِس اعلان کے نتیجے میں جن لوگوں کے خلاف کارروائی کی ضرورت ہو، اُن کے خلاف کارروائی کا آغاز کیا جائے، اِس سے پہلے کوئی کارروائی نہ کی جائے۔ ذوالحجہ اور محرم کے پچاس دنوں کے لیے یہ تعبیر بالکل اُسی طرح اختیار کی گئی ہے، جس طرح ہم اپنی زبان میں بعض اوقات نومبر یا دسمبر کے مہینے میں کہتے ہیں کہ یہ سال گزر جائے تو فلاں کام کیا جائے گا۔

۱۳۳؎ یہ قتل عام کا حکم ہے جو مشرکین عرب کے لیے اُسی طرح کا عذاب تھا جو رسولوں کی تکذیب کے نتیجے میں اُن کے مخاطبین پر ہمیشہ نازل کیا جاتا رہا ہے۔

۱۳۴؎ یعنی خدا کے اِس عذاب سے بچنے کے لیے صرف اتنا کافی نہیں ہے کہ وہ کفر وشرک سے توبہ کر کے اسلام قبول کر لیں، اِس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اپنے ایمان واسلام کی شہادت کے طور پر وہ نماز کا اہتمام کریں اور

كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبۡلِغۡهُ مَاۡمَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَوۡمٌ لَّا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿٦﴾
كَيۡفَ يَكُوۡنُ لِلۡمُشۡرِكِيۡنَ عَهۡدٌ عِنۡدَ اللّٰهِ وَعِنۡدَ رَسُوۡلِهٖۤ اِلَّا الَّذِيۡنَ عٰهَدۡتُّمۡ عِنۡدَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ فَمَا اسۡتَقَامُوۡا لَكُمۡ فَاسۡتَقِيۡمُوۡا لَهُمۡ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ

تمھاری دعوت سننا چاہتا ہے) تو اُس کو امان دے دو، یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔ پھر اُس کو اُس کے مامن تک پہنچا دو۔ یہ اِس لیے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو (خدا کی باتوں کو) نہیں جانتے[۱۳۵]۔ ۱-۶

اللہ اور اُس کے رسول کے ہاں اِن مشرکوں سے کوئی عہد کس طرح باقی رہ سکتا ہے[۱۳۶]؟ ہاں جن لوگوں سے تم نے مسجد حرام کے پاس (حدیبیہ میں) عہد کیا تھا[۱۳۷]، سو جب تک وہ تمھارے ساتھ سیدھے رہیں،

ریاست کا نظم چلانے کے لیے اُس کے بیت المال کو زکوٰۃ ادا کریں۔ اِس کے بعد فرمایا ہے کہ 'فَخَلُّوۡا سَبِيۡلَهُمۡ'، یعنی اُن کی راہ چھوڑ دو۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ ریاست اور قانون کی سطح پر ایمان و اسلام کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اِس سے زائد کوئی مطالبہ کسی مسلمان سے نہیں کیا جا سکتا، اِس لیے کہ جب خدا نے اپنے پیغمبر کو خود اپنی حکومت میں اِس کی اجازت نہیں دی تو دوسروں کو کس طرح دی جا سکتی ہے۔

۱۳۵؎ یعنی دین و شریعت اور نبوت و رسالت سے زیادہ واقف نہیں ہیں، اِس وجہ سے رعایت کے مستحق ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ لمبے عرصے تک تبلیغ و دعوت کے بعد بھی اتمام حجت میں کوئی کسر رہ گئی ہو، لہٰذا اِن میں سے کوئی شخص اگر بات سننے اور سمجھنے کے لیے امان چاہتا ہو تو امان دے دو اور اللہ کا کلام اچھی طرح سنا اور سمجھا کر اُس کے مامن تک پہنچا دو تاکہ وہ ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ غور کر کے فیصلہ کر سکے کہ اُسے اسلام قبول کرنا ہے یا تلوار۔ اِس کے بعد، ظاہر ہے کہ اُس کے لیے بھی وہی حکم ہو گا جو اوپر بیان ہوا ہے۔

۱۳۶؎ یہاں سے روے سخن اُن لوگوں کی طرف ہو گیا ہے جو اِن مشرکوں کے لیے مزید مہلت کے خواہاں تھے۔ اُنھیں صاف نظر آ رہا تھا کہ اِس اعلان کے نتیجے میں اب اُنھیں اپنے عزیزوں، رشتہ داروں اور زمانۂ جاہلیت کے دوست احباب کے خلاف تلوار سونتنی پڑے گی۔ یہ لوگ چونکہ ضعیف الایمان تھے، اِس لیے قدرتی طور پر سخت آزمایش میں مبتلا ہو گئے تھے۔ آگے جو کچھ فرمایا ہے، اِنھی کمزور مسلمانوں کی ذہنی کیفیت کو سامنے رکھ کر فرمایا ہے۔

۱۳۷؎ اصل الفاظ ہیں: 'الَّذِيۡنَ عٰهَدۡتُّمۡ عِنۡدَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ'۔ زبان کے اسالیب سے واقف ہر شخص

الْمُتَّقِيْنَ ﴿۷﴾ كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸﴾ اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا

تم بھی اُن کے ساتھ سیدھے رہو۔[۱۳۸] اِس لیے کہ اللہ اُن لوگوں کو پسند کرتا ہے جو (بدعہدی سے) بچنے والے ہوں۔[۱۳۹]— کس طرح باقی رہ سکتا ہے، جبکہ حال یہ ہے کہ اگر وہ تم پر کہیں غلبہ پا لیں تو نہ تمھارے بارے میں کسی قرابت کا لحاظ کریں، نہ کسی عہد کا؟[۱۴۰] اپنے منہ کی باتوں سے وہ تمھیں راضی کرنا چاہتے ہیں، مگر اُن کے دل انکار کر رہے ہیں اور اُن میں سے اکثر بدعہد ہیں۔ اللہ کی آیتوں کے عوض میں

اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ الفاظ اگر کسی معاہدے کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں تو صرف معاہدۂ حدیبیہ ہی کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں۔ ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے بھی معاہدے مشرکین کے ساتھ کیے، اُن میں سے کوئی بھی مسجد حرام کے ساتھ اِس طرح کی نسبت سے تعارف کا سزاوار نہیں ہو سکتا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اِس نسبت کے اظہار سے ایک طرف تو معاہدے کا تعارف ہو گیا۔ دوسری طرف اِس سے اُس کی غیر معمولی حرمت بھی واضح ہوئی کہ کوئی ایسا ویسا معاہدہ نہیں ہے، بلکہ اِس کی تکمیل جوار حرم میں ہوئی ہے جس سے زیادہ کوئی دوسری جگہ مقدس و محترم نہیں ہو سکتی۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۵۴۳)

۱۳۸؎ یہ بات اگرچہ اوپر بیان ہو چکی ہے کہ ایسے موقت معاہدے جن کی خلاف ورزی نہیں ہوئی، وہ باقی رہیں گے، لیکن معاہدۂ حدیبیہ کی اہمیت چونکہ غیر معمولی تھی اور یہ دس سال کے لیے کیا گیا تھا، اِس لیے سلسلۂ کلام کو روک کر متنبہ کر دیا ہے کہ یہ معاہدہ بھی اُس وقت تک باقی رہے گا، جب تک قریش اِس پر قائم رہتے ہیں۔

۱۳۹؎ اصل میں لفظ 'تَقْوٰی' آیا ہے۔ اِس کے لغوی معنی بچنے کے ہیں۔ جس چیز سے بچنے کی طرف اشارہ مقصود ہے، وہ سیاق سے مفہوم ہو رہی ہے، اِس لیے لفظوں میں بیان نہیں ہوئی۔ قرآن میں جگہ جگہ یہ لفظ اِس طریقے سے استعمال ہوا ہے۔ لفظ 'فِسق' کے معاملے میں بھی آگے یہی اسلوب اختیار فرمایا ہے۔

۱۴۰؎ اصل میں 'اِلًّا' اور 'ذِمَّةً' کے الفاظ آئے ہیں۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''تعلقات کی بنیاد دو ہی چیزوں پر ہوتی ہے۔ معاشرتی تعلقات کی بنیاد رشتۂ رحم و قرابت کے پاس و لحاظ پر اور سیاسی روابط کی بنیاد باہمی معاہدات کی عائد کردہ ذمہ داریوں کے احترام پر۔ پہلی کو 'ال' سے تعبیر فرمایا ہے جو اُن

فَصَدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِہٖ اِنَّھُمۡ سَآءَ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹﴾ لَا یَرۡقُبُوۡنَ فِیۡ مُؤۡمِنٍ اِلًّا
وَّلَا ذِمَّۃً وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡمُعۡتَدُوۡنَ ﴿۱۰﴾ فَاِنۡ تَابُوۡا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ
فَاِخۡوَانُکُمۡ فِی الدِّیۡنِ وَنُفَصِّلُ الۡاٰیٰتِ لِقَوۡمٍ یَّعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۱﴾ وَاِنۡ نَّکَثُوۡۤا اَیۡمَانَھُمۡ

اُنھوں نے تھوڑی قیمت قبول کر لی،[۱۴۱] پھر اُس کی راہ سے رک گئے ہیں۔ یقیناً بہت برا ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں۔ کسی مسلمان کے معاملے میں نہ اُنھیں کسی قرابت کا لحاظ ہے، نہ عہد کا اور وہی زیادتی کرنے والے ہیں۔ سو اگر توبہ کر لیں اور نماز کا اہتمام کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو تمھارے دینی بھائی ہیں۔[۱۴۲] ہم اُن لوگوں کے لیے اپنی آیتوں کی تفصیل کیے دے رہے ہیں جو جاننا چاہتے ہوں۔[۱۴۳] اور اُس عہد کے

حقوق کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ایک اصل ونسل، ایک جوہر ومعدن سے ہونے یا قرابت اور پڑوس کی بنا پر ایک دوسرے پر آپ سے آپ قائم ہو جاتے ہیں۔ دوسری کو 'ذِمَّہ' سے تعبیر فرمایا ہے جو اُن ذمہ داریوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جو کسی معاہدہ میں شریک ہونے والی پارٹیوں پر از روے معاہدہ عائد ہوتی ہیں۔'' (تدبرقرآن ۳/ ۵۴۲)

۱۴۱؎ یعنی دنیا کی متاع حقیر کو ترجیح دی اور خدا کی آیتوں کو چھوڑ کر اُسے اختیار کر لیا۔ آیت میں اِسے 'اِشۡتِرَآء' سے تعبیر کیا ہے۔ زمانۂ قدیم میں خرید وفروخت مبادلۂ اشیا کے طریقے پر ہوتی تھی۔ لفظ 'اِشۡتِرَآء' میں یہ مفہوم اِسی سے پیدا ہوا ہے۔

۱۴۲؎ پیچھے اِنھی شرائط کے بعد فرمایا ہے کہ 'فَخَلُّوۡا سَبِیۡلَھُمۡ'۔ یہاں اُس کی جگہ 'فَاِخۡوَانُکُمۡ فِی الدِّیۡنِ' کے الفاظ ہیں۔ یہ دونوں تعبیرات مل کر حکم کا منشا ہر لحاظ سے واضح کر دیتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اِن شرائط کے پورا ہو جانے کے بعد اُن سے مزید کوئی مطالبہ نہیں کیا جائے گا، قانون اور ریاست کے نقطۂ نظر سے وہ مسلمان سمجھے جائیں گے اور وہ تمام حقوق اُنھیں حاصل ہو جائیں گے جو ایک مسلمان کی حیثیت سے مسلمانوں کے نظم اجتماعی میں اُن کو حاصل ہونے چاہییں۔ اُن میں اور پہلے ایمان لانے والوں کے حقوق وفرائض میں کوئی فرق نہیں ہو گا اور اخوت کا یہ رشتہ قائم ہو جانے کے بعد وہ تمام ذمہ داریاں بھی اُن میں سے ہر ایک پر عائد ہو جائیں گی جو عقل وفطرت کی رو سے ایک بھائی پر اُس کے بھائی کے بارے میں عائد ہونی چاہییں۔

۱۴۳؎ یہ مسلمانوں اور کفار، دونوں کے لیے تنبیہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

مِّنۢ بَعۡدِ عَہۡدِہِمۡ وَ طَعَنُوۡا فِیۡ دِیۡنِکُمۡ فَقَاتِلُوۡۤا اَئِمَّۃَ الۡکُفۡرِ ۙ اِنَّہُمۡ لَاۤ اَیۡمَانَ لَہُمۡ لَعَلَّہُمۡ یَنۡتَہُوۡنَ ﴿۱۲﴾

اَلَا تُقَاتِلُوۡنَ قَوۡمًا نَّکَثُوۡۤا اَیۡمَانَہُمۡ وَ ہَمُّوۡا بِاِخۡرَاجِ الرَّسُوۡلِ وَ ہُمۡ بَدَءُوۡکُمۡ

بعد[144] بھی جو اُنھوں نے کر رکھا ہے، اگر وہ اپنے قول و قرار توڑ ڈالیں اور تمھارے دین میں عیب لگائیں تو کفر کے اِن سرخیلوں سے بھی لڑو[145]۔ اِن کے قول و قرار کچھ نہیں، (اِس لیے آج نہیں تو کل اپنا عہد توڑ دیں گے، لہٰذا لڑو) تاکہ یہ (اِس کفر و شرک سے) باز آ جائیں۔ ۷-۱۲

(ایمان[146] والو)، کیا اب بھی اُن لوگوں سے نہیں لڑو گے جنھوں نے اپنے قول و قرار توڑ دیے ہیں

"...مطلب یہ ہے کہ جو لوگ جاننا اور سمجھنا چاہیں، اُن کے لیے اِس باب میں اللہ کے احکام کی پوری وضاحت کر دی گئی ہے۔ کوئی ابہام باقی نہیں رہا ہے۔ اب اگر مسلمانوں میں سے کسی نے اِن مشرکین کے ساتھ اِس سے الگ ہو کر کوئی معاملہ کرنا چاہا تو اُس کی ذمہ داری خود اُسی پر ہے، اِسی طرح مشرکین میں سے اگر کسی نے اِس سے کچھ الگ امید باندھی تو اُس کی ذمہ داری بھی خود اُسی پر ہے۔" (تدبر قرآن ۳/ ۵۴۴)

۱۴۴؎ یعنی معاہدۂ حدیبیہ جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اُس کے لیے یہ الفاظ عہد کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے آئے ہیں، اِن سے کوئی نیا معاہدہ مراد نہیں ہے۔

۱۴۵؎ اصل میں 'اَئِمَّۃَ الۡکُفۡرِ' کے الفاظ ہیں۔ اِن کا اطلاق قریش کے سوا کسی اور پر نہیں ہو سکتا تھا۔ وہی پورے عرب کے سردار اور پیشوا تھے اور دین کے معاملے میں تمام اہل عرب اُنھی کے تابع تھے۔ مدعا یہ ہے کہ اگر قریش بھی اپنا معاہدہ توڑ دیں تو اُن سے بھی لڑو اور ایمان و اسلام کی دعوت قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوں تو جہاں پاؤ، قتل کر دو۔ سرزمین عرب کے تمام مشرکین کے لیے یہی اللہ کا حکم ہے۔ اِس میں اب کسی کے لیے مزید رعایت کی گنجایش باقی نہیں رہی۔

۱۴۶؎ یہ سورہ چند شذرات کا مجموعہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منکرین پر عذاب کے مراحل میں ہر مرحلے کی مناسبت سے نازل ہوئے اور اِنھی مراحل کی ترتیب کے ساتھ سورہ میں جمع کر دیے گئے ہیں۔ اِن میں سے

اَوَّلَ مَرَّةٍ اَتَخۡشَوۡنَهُمۡ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنۡ تَخۡشَوۡهُ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۳﴾ قَاتِلُوۡهُمۡ
يُعَذِّبۡهُمُ اللّٰهُ بِاَيۡدِيۡكُمۡ وَيُخۡزِهِمۡ وَيَنۡصُرۡكُمۡ عَلَيۡهِمۡ وَيَشۡفِ صُدُوۡرَ قَوۡمٍ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۴﴾

اور جنھوں نے (اِس سے پہلے) رسول کو (اُس کے وطن سے) نکالنے کی جسارت کی تھی[۱۴۷] اور وہی ہیں جنھوں نے تم سے جنگ چھیڑنے میں پہل کی[۱۴۸]۔ کیا تم اُن سے ڈرتے ہو؟ اللہ زیادہ حق دار ہے کہ تم اُس سے ڈرو، اگر تم فی الواقع مومن ہو۔ اُن سے لڑو، اللہ تمھارے ہاتھوں سے اُن کو سزا دے گا[۱۴۹] اور اُنھیں ذلیل وخوار کرے گا[۱۵۰] اور تمھیں اُن پر غلبہ عطا فرمائے گا اور مومنوں کے ایک گروہ کے کلیجے (اِس

پہلا شذرہ آیت ۱۲ پر ختم ہو گیا ہے۔ یہاں سے دوسرا شروع ہوتا ہے جس کی پہلی آیت ہی واضح کر دیتی ہے کہ یہ کچھ فصل سے نازل ہوا ہے، اِس لیے کہ اوپر جس معاہدے کے بارے میں فرمایا تھا کہ اگر توڑ دیں، یہ آیت بتا رہی ہے کہ وہ معاہدہ قریش نے توڑ دیا ہے۔

۱۴۷؎ مطلب یہ ہے کہ اِن کا یہ پہلا جرم نہیں ہے، اِس سے پہلے یہ خدا کے رسول کو اُس کے وطن سے نکالنے کی جسارت کر چکے ہیں۔ قرآن کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کی تکذیب کے بعد جب کوئی قوم اُسے وطن سے نکالنے یا قتل کر دینے کا فیصلہ کر لیتی ہے تو اُس کی مہلت عمر بھی ختم ہو جاتی ہے۔ رسولوں کے باب میں یہی سنت الٰہی ہے۔ قرآن نے یہ اُسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اِس سے مزید وضاحت ہو گئی کہ یہ آیتیں قریش ہی سے متعلق ہیں، اِن کا کسی دوسرے قبیلے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۱۴۸؎ یعنی جب ہجرت کے موقع پر قتل کر دینے میں کامیاب نہیں ہوئے تو قافلے کی حفاظت کا بہانہ کر کے حملہ آور ہو گئے اور اِس طرح خدا کے رسول اور اُس کے ساتھیوں کے خلاف صریح جارحیت کا ارتکاب کیا۔ یہ جنگ بدر کی طرف اشارہ ہے جس سے اُس بات کی تائید ہوتی ہے جو پیچھے بیان ہو چکی ہے کہ اِس جنگ کے لیے پیش قدمی تمام تر قریش کی طرف سے ہوئی تھی۔

۱۴۹؎ یہ قرآن نے خود صراحت فرما دی ہے کہ پیچھے جس قتل عام کا حکم دیا ہے، وہ درحقیقت خدا کا عذاب ہے جو آخری پیغمبر کے منکرین پر اُس کے ساتھیوں کے ہاتھوں سے نازل کیا جا رہا ہے۔

۱۵۰؎ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ رسولوں کی تکذیب کا اصلی محرک استکبار ہوتا ہے اور استکبار کی سزا دنیا اور آخرت میں ذلت اور خواری ہی ہے۔

وَ یُذۡهِبۡ غَیۡظَ قُلُوۡبِهِمۡ وَ یَتُوۡبُ اللّٰهُ عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ وَ اللّٰهُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ ﴿۱۵﴾
اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تُتۡرَکُوۡا وَ لَمَّا یَعۡلَمِ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ جٰهَدُوۡا مِنۡکُمۡ وَ لَمۡ یَتَّخِذُوۡا
مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَ لَا رَسُوۡلِهٖ وَ لَا الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَلِیۡجَةً وَ اللّٰهُ خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۶﴾
مَا کَانَ لِلۡمُشۡرِکِیۡنَ اَنۡ یَّعۡمُرُوۡا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِیۡنَ عَلٰۤی اَنۡفُسِهِمۡ بِالۡکُفۡرِ

سے) ٹھنڈے کرے گا[۱۵۱] اور اُن کے دلوں کا غم وغصہ دور فرمائے گا اور (اِن منکروں میں سے) جن کو چاہے گا، اللہ توبہ کی توفیق بھی دے گا۔ اللہ علیم و حکیم ہے[۱۵۲]۔ ۱۳-۱۵

کیا تم نے گمان کر رکھا ہے کہ یوں ہی چھوڑ دیے جاؤ گے، دراں حالیکہ اللہ نے اُن لوگوں کو ابھی جانا ہی نہیں جنھوں نے تم میں سے جہاد کیا اور اللہ اور اُس کے رسول اور اُن کے ماننے والوں کے سوا کسی کو دوست نہیں بنایا[۱۵۳]۔ (یاد رکھو)، جو کچھ تم کر رہے ہو، اللہ اُس سے خوب واقف ہے۔ (تم اِنھیں بیت اللہ کے متولی سمجھتے ہو اور اِسی بنا پر اُن سے ہم دردی رکھتے ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ) اِن مشرکوں کو یہ

۱۵۱؎ اُس گروہ کی طرف اشارہ ہے جسے اسلام لانے کے جرم میں برسوں ستایا گیا تھا۔ اُن کی دل داری کے لیے فرمایا ہے کہ جن سنگ دلوں کے ہاتھوں تم مظالم کا ہدف بنے رہے ہو، اب اُن کی سزا کا وقت آ گیا ہے۔ مطمئن رہو، یہ سزا ایسی عبرت ناک ہو گی کہ تمھارے سینے اِس سے ٹھنڈے ہو جائیں گے۔

۱۵۲؎ مسلمانوں کا ایک گروہ آرزومند تھا کہ اُن کے اعزہ واقربا عذاب الٰہی سے دوچار ہونے کے بجاے ایمان لے آئیں۔ یہ اُن کو خوش خبری دی ہے کہ تمھاری یہ آرزو بھی کسی حد تک پوری ہو جائے گی اور اللہ اپنے علم و حکمت کے مطابق جس کو چاہے گا، توبہ اور اصلاح کی توفیق بھی عطا فرمائے گا۔

۱۵۳؎ مطلب یہ ہے کہ ابھی جماعت کی تطہیر نہیں ہوئی اور وہ لوگ پوری طرح الگ نہیں ہوئے جو سچے مجاہدین ہوں اور اللہ و رسول اور اُن کے ماننے والوں کے سوا کسی کی دوستی اور قرابت کی پروا نہ کریں۔ اِس وقت جو دینونت برپا ہے، اُس کے لیے اُنھیں الگ کرنا ضروری ہے۔ یہ امتحان اِسی مقصد سے برپا کیا جا رہا ہے، ورنہ خدا کے لیے کچھ مشکل نہ تھا کہ آسمان سے عذاب نازل کرتا اور جن لوگوں سے تمھیں لڑنے کے لیے کہا جا رہا ہے، اُنھیں اُسی طرح صفحۂ ہستی سے مٹا دیتا، جس طرح عاد و ثمود صفحۂ ہستی سے مٹا دیے گئے تھے۔

اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۷﴾ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ
مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ
فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۸﴾ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ

حق نہیں پہنچتا کہ اللہ کی مسجدوں[۱۵۴] کا انتظام کریں، دراں حالیکہ وہ خود اپنے اوپر کفر کے گواہ ہیں[۱۵۵]۔ اُن کے سارے اعمال ضائع ہو گئے[۱۵۶] اور وہ ہمیشہ آگ میں رہنے والے ہیں۔ اللہ کی مسجدوں کا انتظام کرنے والے تو وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اللہ اور روز آخر کو مانتے ہوں، نماز کا اہتمام کرتے ہوں، زکوٰۃ دیتے ہوں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتے ہوں[۱۵۷]۔ یہ لوگ، توقع ہے کہ راہ یاب ہوں گے[۱۵۸]۔ کیا تم نے

۱۵۴؎ یہ قرآن کی بلاغت ہے۔ اِس سے مراد اگرچہ مسجد حرام ہی ہے، لیکن اللہ کی مسجدوں کے الفاظ سے حکم بھی عام ہو گیا ہے اور اُس کی علت بھی پوری طرح واضح ہو گئی ہے۔

۱۵۵؎ قریش اپنے شرک کا خود اعتراف کرتے تھے۔ اُسی کو یہاں کفر سے تعبیر کیا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ شرک کے ساتھ خدا کو ماننا اُس کو نہ ماننے کے مترادف ہے۔

۱۵۶؎ اللہ شرک کے ساتھ کسی نیکی کو بھی قبول نہیں کرتا۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ جو اعمال وہ حرم کی خدمت کے لیے کر رہے ہیں، آخرت میں اُن کا کوئی اجر اُن کے لیے باقی نہ رہے گا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

’’...خدا کے ہاں صرف وہی نیکی باقی رہتی ہے جو توحید کے ساتھ ہو۔ مذہبی صحیفوں میں مشرک کو زانیہ عورت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جس طرح ایک عورت کا اپنے شوہر کے ساتھ سارا چاؤ پیار بے کار ہے، اگر وہ بدکار ہے، اُسی طرح بندے کا سارا کیا دھرا برباد ہے، اگر وہ اپنے رب کا کسی کو شریک ٹھیراتا ہے۔‘‘ (تدبر قرآن ۳/ ۵۵۰)

۱۵۷؎ یعنی اُن کے اندر کسی غیر اللہ کا خوف نہ ہو۔ یہ شرک کے اصلی محرک سے اُس کی نفی کی ہے۔ مدعا یہ ہے کہ حرم کی تولیت، بے شک اولاد ابراہیم کے سپرد کی گئی ہے، مگر اِس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اُن صفات کے حامل بن کر رہیں جو اِس منصب کے لیے بنیادی شرائط کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اِن میں اہم ترین شرط یہ ہے کہ وہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائیں۔

۱۵۸؎ اصل میں لفظ ’اِهْتِدَاء‘ استعمال ہوا ہے۔ یہ ہدایت منزل کے مفہوم میں ہے۔ یعنی کامیابی کے ساتھ اُس منزل تک پہنچیں گے جو آخرت میں اُن کے لیے مقرر کی گئی ہے۔ آیت میں ’عَسٰی‘ کا لفظ بھی قابل توجہ ہے۔ استاذ

الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَوٗنَ
عِنْدَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَاللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۲۰﴾
يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ﴿۲۱﴾ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَآ اَبَدًا اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۲﴾

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ

حاجیوں کے پانی پلانے اور مسجد حرام کا انتظام کر دینے کو اُن لوگوں کے برابر کر دیا ہے جو اللہ اور روز آخر پر ایمان لائے اور جنھوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا ہے۔ اللہ کے نزدیک یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ (حقیقت یہ ہے کہ مسجد حرام کے اِن مجاوروں نے اپنے اوپر ظلم ڈھایا ہے) اور (اب) اللہ اِن ظالموں کو راہ یاب نہیں کرے گا۔[۱۵۹] اللہ کے ہاں اُن لوگوں کا درجہ بڑا ہے[۱۶۰] جو ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت کی اور اپنے جان و مال سے خدا کی راہ میں جہاد کیا۔ وہی کامیاب ہوں گے۔ اُن کا پروردگار اُنھیں اپنی رحمت اور خوشنودی اور ایسے باغوں کی بشارت دیتا ہے جن میں اُن کے لیے دائمی نعمت ہے۔ وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اجر عظیم اللہ ہی کے پاس ہے۔ ۱۹-۲۲

امام لکھتے ہیں:

''...اِس بات کو 'عَسٰی' کے لفظ سے تعبیر کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ یہ راہ کوئی آسان راہ نہیں ہے۔ اِس میں قدم قدم پر مشکلات اور آزمایشیں ہیں۔ صرف وہی لوگ جادۂ مستقیم پر استوار رہ سکتے ہیں جن کے پاس توفیق الٰہی کا زادراہ ہو اور جن کو خدا سے استعانت کا سہارا حاصل ہو۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۵۵۰)

۱۵۹؎ یعنی اُس منزل تک پہنچائے گا جو آخرت میں اہل ایمان کی منزل ہے۔

۱۶۰؎ یہ تقابل کے لیے نہیں، بلکہ تفخیم شان کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اُن کا درجہ اللہ کے ہاں بہت اونچا ہے۔

عَلَى الْاِيْمَانِ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ

ایمان[۱۶۱] والو، اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی اپنا دوست نہ بناؤ، اگر وہ ایمان کے مقابلے میں کفر کو عزیز رکھیں۔ تم میں سے جو لوگ اُنھیں دوست بنائیں گے، وہی (اپنے اوپر) ظلم کرنے والے ہوں گے۔ اِن سے کہہ دو، (اے پیغمبر) کہ اگر تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے، تمھارے بھائی، تمھاری بیویاں، تمھارا خاندان اور تمھارا وہ مال جو تم نے کمایا ہے اور وہ تجارت جس کے مندے سے تم ڈرتے ہو اور تمھارے وہ گھر جنھیں تم پسند کرتے ہو[۱۶۲]، یہ سب تمھیں اللہ سے، اُس کے رسول سے اور اُس کی راہ میں

۱۶۱؎ یہاں سے تیسرا شذرہ شروع ہوتا ہے۔ اِس کے مضامین سے واضح ہے کہ یہ ۹ ہجری میں کسی وقت اُس حج سے پہلے نازل ہوا ہے جس میں تمام اہل عرب سے اعلان براءت کیا گیا تھا۔

۱۶۲؎ یہ جن مرغوبات کی فہرست ہے، اُن میں، اگر غور کیجیے تو نہایت لطیف نفسیاتی ترتیب ملحوظ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... پہلے باپ، بیٹے، بھائی، بیوی اور خاندان کو لیا ہے جن کی محبت یا عصبیت آدمی کے لیے حق کی راہ میں حجاب اور آزمایش بنتی ہے۔ پھر اموال، کاروبار اور مکانات کا ذکر کیا ہے جو اصلاً مذکورہ متعلقین ہی کے تعلق سے مطلوب و مرغوب ہوتے ہیں اور آدمی صاحب توفیق نہ ہو تو اُس کے لیے یہ فتنہ بن جاتے ہیں۔ اموال کے ساتھ 'اِقْتَرَفْتُمُوْهَا' کی قید ہے۔ 'اِقْتِرَاف' کے معنی اکتساب کے ہیں۔ یہ قید اُس مال کے محبوب ہونے کو ظاہر کرتی ہے۔ قاعدہ ہے کہ جس مال کو آدمی نے خود کمایا اور بڑھایا ہو، وہ اُس کو زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ اِسی طرح 'تجارت' کے ساتھ 'تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا' کی قید اِس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ وہ تجارت کامیاب اور چلتی ہوئی تجارت ہے، اِس لیے کہ کامیاب اور چلتی ہوئی تجارت ہی وہ چیز ہے جس کے متعلق تاجر کو ہر وقت یہ اندیشہ لاحق رہتا ہے کہ اُس پر کساد بازاری کا جھونکا نہ آجائے اور اِس خطرے سے اُس کو بچائے رکھنے کے لیے وہ سارے جتن کرتا ہے، یہاں تک کہ وہی اُس کی معبود بن جاتی ہے۔ پھر نہ تو اُسے حلال و حرام کی تمیز باقی رہ جاتی ہے اور نہ ہجرت، جہاد اور اللہ کی راہ میں قطع علائق کی آزمایشیں اُسے گوارا ہوتیں۔ فرمایا کہ اِن میں سے ہر چیز ایک بت ہے اور جب

فِیْ سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ﴿۲۴﴾
لَقَدْ نَصَرَکُمُ اللّٰهُ فِیْ مَوَاطِنَ کَثِیْرَةٍ وَّیَوْمَ حُنَیْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْکُمْ کَثْرَتُکُمْ فَلَمْ
تُغْنِ عَنْکُمْ شَیْئًا وَّضَاقَتْ عَلَیْکُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّیْتُمْ مُّدْبِرِیْنَ ﴿۲۵﴾
ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَکِیْنَتَهٗ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَعَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا

جہاد سے زیادہ عزیز ہیں[۱۶۳] تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر کر دے[۱۶۴] اور (جان لو کہ) اِس طرح کے بدعہدوں کو اللہ راہ یاب نہیں کرے گا۔[۱۶۵] حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے بہت سے موقعوں پر تمھاری مدد کی ہے۔ ابھی حنین کے دن بھی، جب تم اپنی کثرت پر اترا رہے تھے۔ پھر وہ کثرت تمھارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعتوں کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی۔ پھر تم پیٹھ دکھا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ بالآخر اللہ نے اپنے رسول پر اور اُس کے ماننے والوں پر اپنی سکینت نازل فرمائی[۱۶۶] اور (اُن کی مدد کے لیے) ایسی

تک بندہ اللہ کی خاطر ان میں سے ہر بت کو توڑنے کے لیے تیار نہ ہو جائے، وہ ایمان کے تقاضے پورے نہیں کر سکتا۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۵۵۳)

۱۶۳؎ یہ چیز اُس وقت واضح ہو جاتی ہے، جب ایک طرف اللہ و رسول کا مطالبہ ہو اور دوسری طرف اِن چیزوں کی محبت کا کوئی مطالبہ سامنے آ جائے۔ آدمی اگر اُس وقت اللہ و رسول کے مطالبے کو مقدم نہ رکھے تو اِس کے صاف معنی یہ ہوں گے کہ اُس کو اللہ و رسول سے زیادہ یہ چیزیں محبوب ہیں۔ ایمان و اسلام کا مطالبہ یہ نہیں ہے کہ یہ چیزیں محبوب نہ ہوں، بلکہ صرف یہ ہے کہ اللہ و رسول اور اُس کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب نہ ہوں۔

۱۶۴؎ یعنی اُسی انجام بد تک پہنچا دے جو اوپر مکذبین کے لیے بیان ہوا ہے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ اوپر جس ترجیح کا ذکر ہوا ہے، وہ ایمان کا ایسا تقاضا ہے کہ جسے پورا نہ کیا جائے تو مومن و کافر اپنے انجام کے لحاظ سے یکساں ہو سکتے ہیں۔

۱۶۵؎ اوپر مشرکین کے بارے میں ارشاد ہوا تھا کہ اللہ اُنھیں راہ یاب نہیں کرے گا۔ یہاں وہی بات اُن لوگوں کے متعلق فرمائی ہے جو ایمان و اسلام کا عہد باندھ لینے کے بعد منافقت کا رویہ اختیار کریں اور اپنے ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے سے انکار کر دیں۔

وَعَذَّبَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَذٰلِکَ جَزَآءُ الْکٰفِرِیْنَ ﴿۲۶﴾ ثُمَّ یَتُوْبُ اللّٰہُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِکَ
عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۲۷﴾
یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِکُوْنَ نَجَسٌ فَلَا یَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ

فوجیں اتار دیں جنھیں تم نے نہیں دیکھا[۱۶۷] اور اُن لوگوں کو سزا دی جو (پیغمبر کے) منکر ہیں، اور اِس طرح کے منکروں کی یہی سزا ہے[۱۶۸]۔ پھر (دیکھ چکے ہو کہ) اللہ اِس کے بعد جس کو چاہتا ہے، توبہ کی توفیق بھی دیتا ہے۔ اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے[۱۶۹]۔ ۲۳-۲۷

ایمان والو، یہ مشرکین بالکل ناپاک ہیں، لہٰذا اپنے اِس سال کے بعد یہ مسجد حرام کے پاس نہ پھٹکنے

۱۶۶؎ یعنی دلوں میں عزم، حوصلہ اور قرار پیدا کر دیا۔

۱۶۷؎ فرشتوں کی غیبی فوجوں کی طرف اشارہ ہے جو زمانۂ رسالت کی مہمات میں ہمیشہ مسلمانوں کے ہم رکاب رہتی تھیں۔

۱۶۸؎ جن مذبذبین کو اوپر قتال کے لیے ابھارا ہے، یہ اُن کی ہمت افزائی فرمائی ہے کہ جس کام کے لیے تمھیں کہا جا رہا ہے، وہ خدا کا کام ہے۔ تمھاری کثرت و قلت اُس میں کچھ اہمیت نہیں رکھتی۔ اِس سے پہلے بھی وہ خدا کی مدد سے ہوا ہے اور اب بھی اُسی کی مدد سے ہوگا۔ اُس پر بھروسا رکھو۔ تم نے تقویٰ اختیار کیا اور ثابت قدم رہے تو وہ کسی حال میں تمھیں اپنی مدد سے محروم نہیں کرے گا۔ اِس میں خاص طور پر غزوۂ حنین کا حوالہ دیا ہے۔ یہ غزوہ فتح مکہ کے بعد شوال ۸ / ہجری میں مکے اور طائف کے درمیان وادی حنین میں پیش آیا تھا۔ مسلمانوں کی طرف سے اِس میں ۱۲ ہزار فوج تھی جسے اُس وقت کے حالات میں ایک لشکر جرار کہا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف منکرین اُن کے مقابلے میں بہت کم تھے۔ لیکن اِس کے باوجود قبیلۂ ہوازن کے تیر اندازوں نے اُن کا منہ پھیر دیا اور مسلمان شکست کھا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اِس کی وجہ یہ ہوئی کہ اُس دن وہ اپنی کثرت تعداد کے غرے میں مبتلا ہو گئے۔ چنانچہ بہتوں کے اندر نہ خدا کی یاد کی طرف توجہ باقی رہی، نہ نظم و اطاعت اور اخلاص و انابت کا وہ اہتمام رہا جس کی تاکید پیچھے سورۂ انفال میں کی گئی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے چند مٹھی بھر صحابہ، البتہ پوری استقامت کے ساتھ جمے رہے۔ چنانچہ اُنھی کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے کچھ تذکیر و تنبیہ کے بعد مدد فرمائی اور بالآخر فتح حاصل ہوگئی*۔

---

* السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۴/ ۶۹۔

عَامِهِمْ هٰذَا وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَآءَ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۸﴾

پائیں[۱۷۰] اور (اِس کے نتیجے میں) اگر تمھیں تنگ دستی کا اندیشہ ہے تو (مطمئن رہو)، اللہ چاہے گا تو عنقریب اپنے فضل سے تمھیں غنی کر دے گا۔[۱۷۱] اِس میں شبہ نہیں کہ اللہ علیم و حکیم ہے۔[۱۷۲] ۲۸

۱۶۹؎ یہ وہی مضمون ہے جو اوپر آیت ۱۵ میں گزر چکا ہے۔

۱۷۰؎ جس اعلان براءت سے سورہ کی ابتدا ہوئی ہے، یہ اُسی کی تکمیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مشرکین عقیدے کی جس نجاست میں مبتلا ہیں، اُس کے ساتھ یہ حج وعمرہ کے لیے بھی حدود حرم میں داخل نہیں ہو سکتے۔ بیت اللہ توحید کا مرکز ہے، اِس میں اب اِن میں سے کسی مشرک کا داخل ہونا گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ خدا کے پیغمبر کی تکذیب کے بعد اِن کے لیے اسلام ہے یا تلوار۔ تاہم معاہدات کی مدت پوری کرنے کے لیے کسی کو مہلت بھی دی گئی ہو تو اِس سال کے بعد اُسے حرم میں آنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ یہ حکم، ظاہر ہے کہ اُنھی مشرکین کے لیے تھا جن کے شرک کی نجاست اُن پر اتمام حجت کے درجے میں واضح کر دی گئی تھی۔ اِس کا اُن لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے جو اُن کے بعد اب توحید کے اِس مرکز کو دیکھنے اور اِس کی دعوت کو سمجھنے کے لیے وہاں جانا چاہتے ہوں۔

۱۷۱؎ حج کو اُس زمانے میں تجارت اور کاروبار کے پہلو سے بھی بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یہ اُسی کے پیش نظر فرمایا ہے کہ اِس حکم سے کسی کو تشویش نہ ہو کہ مشرکین نہیں آئیں گے تو اِس سے کاروبار اور تجارت پر برا اثر پڑے گا جس سے مسلمانوں کی معاشی حالت جو پہلے ہی خراب ہے، خراب تر ہو جائے گی۔ لوگ مطمئن رہیں۔ خدا کی مدد اُن کے شامل حال ہے۔ وہ عنقریب اِس پہلو سے بھی اُن کو مستغنی کر دے گا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ یہ وعدہ پورا ہوا اور اِس طرح پورا ہوا کہ ایک دن کے لیے بھی مکہ کی تجارت اِس بندش سے متاثر نہ ہوئی اور کچھ عرصہ بعد تو یہ حال ہوا کہ مصر و شام اور روم و ایران کے خزانے بھی اونٹوں پر لدلد کر اسلام کے بیت المال میں پہنچنے لگے اور اللہ نے اپنے فضل سے مسلمانوں کو اِس طرح غنی کر دیا کہ لوگ اپنی زکوٰۃ کا مال مدینہ کی گلیوں میں لیے پھرتے تھے، لیکن اُس کا کوئی لینے والا نہیں ملتا تھا۔“ (تدبر قرآن ۳/ ۵۵۶)

اِس میں مسلمانوں کے لیے یہ سبق ہے کہ وہ اگر ایمانی اقدار کی حفاظت کے لیے کسی وقت اپنے معاشی مصالح قربان کریں گے تو اُنھیں خدا پر بھروسا رکھنا چاہیے۔ وہ اُن کے نقصان کی تلافی کے لیے ایسی راہیں کھول سکتا ہے جن

کا وہ گمان بھی نہ رکھتے ہوں۔

۲۷۱؎ مطلب یہ ہے کہ تم اپنے لحاظ سے سوچتے ہو، لیکن اللہ علیم و حکیم ہے، اُس نے یہ حکم دیا ہے تو اِس کے نتائج و عواقب بھی اُس سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ اُس پر بھروسا رکھو، اُس کے تمام کام علم و حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔

[باقی]

''یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ انسان خدا سے محبت نہیں کر سکتا۔ خدا مخفی ضرور ہے، لیکن اس کے مخفی ہونے کی مثال یوں ہے کہ گویا تل کے اوٹ میں پہاڑ ہو۔ آسمان اور زمین کے ہر گوشے سے اس کی منادی ہو رہی ہے۔ ابر اور ہوا سب اس کی شہادت دے رہے ہیں۔ دریا اور پہاڑ سب اس کے گواہ ہیں۔ پرندے اس کی حمد کے گیت گاتے اور درخت ان کے نغموں سے سرشار ہو کر جھوم رہے ہیں۔ اس دنیا کے ذرہ ذرہ پر اس کا نقش کندہ اور ایک ایک پتا پر اس کی گواہی ثبت ہے۔ ایک ایسی ذات کو مخفی سمجھنا انسان کی اپنی عقل کا قصور ہے۔ اللہ تعالیٰ مخفی نہیں، بلکہ بدیہی ہے، بلکہ صحیح تر لفظوں میں یوں کہیے کہ ابدہ البدیہیات ہے۔'' (''تزکیۂ نفس'' از مولانا امین احسن اصلاحی ۲/ ۶۰)

معز امجد
ترجمہ: شاہد رضا

بعض منکرین کو مہلت نہ دینے کے متعلق پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم

روی أنه لما كان يوم فتح مكة أمن رسول اللّٰه الناس إلا أربعة نفر وامرأتين، وقال: اقتلوهم وإن وجدتموهم متعلقين بأستار الكعبة : عكرمة بن أبی جهل وعبد اللّٰه بن خطل ومقيس بن صبابة و عبد اللّٰه بن سعد بن أبی السرح وقينتان كانتا لمقيس تغنيان بهجاء رسول اللّٰه.

فأما عبد اللّٰه بن خطل فأدرك وهو متعلق بأستار الكعبة فاستبق إليه سعيد بن حريث وعمار بن ياسر فسبق سعيد عمارًا وكان أشب الرجلين فقتله.

وأما مقيس بن صبابة فأدركه الناس فی السوق فقتلوه.

وأما عكرمة فركب البحر فأصابتهم عاصف فقال أصحاب السفينة : أخلصوا فإن آلهتكم لا تغنی عنكم شيئًا هاهنا، فقال عكرمة: واللّٰه لئن لم ينجنی من البحر إلا الإخلاص لا ينجينی فی البر غيره، أللهم إن لك علی

عهـدًا إن أنـت عافيتنى مما أنا فيه أن آتى محمدًا حتى أضع يدى فى يده فلأجدنه عفوًا كريمًا فجاء فأسلم.

وأما عبد اللّٰه بن سعد بن أبى السرح فإنه اختبأ عند عثمان بن عفان. فلما دعا رسول اللّٰه الناس إلى البيعة جاء به حتى أوقفه على النبى. قال: يا رسول اللّٰه، بايع عبد اللّٰه، قال: فرفع رأسه فنظر إليه ثلاثًا كل ذلك يأبى، فبـايعه بعد ثلاث. ثم أقبل على أصحابه فقال: أما كان فيكم رجل رشيد يقوم إلى هذا حيث رآنى كففت يدى عن بيعته فيقتله؟ فقالوا: وما يدرينا يا رسول اللّٰه ما فى نفسك، هلا أومأت إلينا بعينك؟ قال: إنه لا ينبغى لنبى أن يكون له خائنة أعين.

وأما قينتان قتلت إحداهما وأفلتت الأخرى وأسلمت.

بیان کیا جاتا ہے کہ فتح مکہ کے دن پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سوائے چار مردوں اور دو عورتوں کے عام معافی دے دی۔ آپ نے فرمایا: انھیں قتل کر دو، اگرچہ تم انھیں کعبہ کے پردوں کے ساتھ بھی چمٹے ہوئے پاؤ۔ (جن لوگوں کو معافی نہیں دی گئی تھی، وہ یہ تھے:) عکرمہ بن ابی جہل، عبداللہ بن خطل، مقیس بن صبابہ، عبداللہ بن سعد بن ابی سرح اور مقیس کی دو لونڈیاں جو پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف ہجویہ گیت (لکھتی اور) گاتی تھیں۔

جہاں تک عبداللہ بن خطل کا تعلق ہے، اسے کعبہ کے پردوں کے ساتھ چمٹے ہوئے پایا گیا۔ حضرت سعید بن حریث اور حضرت عمار بن یاسر نے اس کی طرف ایک دوسرے سے مسابقت کی اور اس تک پہنچنے کے لیے حضرت سعید نوجوان ہونے کی وجہ سے حضرت یاسر سے آگے بڑھ گئے اور آپ نے عبداللہ بن خطل کو قتل کر دیا۔

جہاں تک مقیس بن صبابہ کا تعلق ہے، اسے بازار میں موجود ایک گروہ نے گرفتار کر لیا اور اسے قتل کر دیا۔

جہاں تک عکرمہ کا تعلق ہے، وہ سمندر میں سوار ہو کر فرار ہو گیا۔ (جب وہ جہاز پر تھا) انھیں ایک سخت طوفان کا سامنا کرنا پڑا۔ جہاز کے لوگوں نے کہا: صرف ایک خدا سے دعا کرو، کیونکہ تمھارے باطل خدا تمھیں یہاں کچھ فائدہ نہیں دیں گے۔ (اس بات کو سن کر) عکرمہ نے کہا: اگر یہاں میرے سچے ایک خدا سے دعا کرنے کے علاوہ مجھے کوئی چیز نہیں بچا سکتی تو پھر زمین میں اس کے علاوہ یقیناً کوئی چیز مجھے نہیں بچا سکتی۔ میرے پروردگار، میں تجھ سے عہد کرتا ہوں کہ اگر تو نے آج مجھے اس سے بچا لیا جس میں میں ہوں تو میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جاؤں گا تاکہ میں (ان کی اطاعت کا اظہار کرتے ہوئے) اپنے ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے سکوں۔ مجھے یقین ہے کہ میں ان کی طرف سے نہایت کریمانہ معافی پاؤں گا۔

جہاں تک عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح کا تعلق ہے، اس نے اپنے آپ کو حضرت عثمان بن عفان کے گھر میں چھپا لیا۔ بعد ازاں، جب پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے لوگوں کو بیعت اطاعت کے لیے دعوت دی تو حضرت عثمان اس کو لے کر آئے اور پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس کھڑا کر کے کہا: یا رسول اللہ، عبد اللہ کی بیعت قبول فرمائیے۔ راوی کہتے ہیں: پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے سر کو اٹھایا اور عبد اللہ کی طرف تین مرتبہ دیکھا اور ہر دفعہ (خاموشی سے) اس کی بیعت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر تیسری مرتبہ آپ نے اس کی بیعت قبول فرما لی۔ پھر (عبد اللہ کے جانے کے بعد) پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے صحابہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: کیا تم میں کوئی ایسا عقل مند آدمی نہیں تھا جو کھڑا ہوتا اور اس آدمی کو قتل کر دیتا، جبکہ اس نے مجھے بیعت قبول کرنے سے احتراز کرتے ہوئے دیکھا ہے؟ انھوں نے کہا کہ یا رسول اللہ، ہم نہیں جانتے تھے کہ آپ کیا سوچ رہے تھے، آپ نے ہمیں اپنی آنکھ کے ساتھ اشارہ کیوں نہیں کیا؟ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: کسی پیغمبر کے

لیے مناسب نہیں کہ وہ اپنی آنکھوں کے ساتھ خفیہ طور پر اشارے کرے۔

جہاں تک لونڈیوں کا تعلق ہے، تو ان میں سے ایک کو قتل کر دیا گیا، جبکہ دوسری کو آزاد کر دیا گیا اور اس نے اسلام قبول کر لیا۔

ترجمے کے حواشی:

ا۔ بعض تاریخی روایات میں جن لوگوں کو معافی نہیں دی گئی تھی، ان کی کل تعداد نو تھی، چھ مرد اور تین عورتیں[1]۔ جبکہ بعض دیگر روایات میں چھ کے بجائے، جیسا کہ مذکورہ متن میں بیان کیا گیا ہے، ان کی تعداد دس تھی، چھ آدمی اور چار عورتیں[2]۔ ان لوگوں کے نام اس طرح روایت کیے گئے ہیں: عبداللہ بن سعد بن ابی سرح، عکرمہ بن ابی جہل، عبداللہ بن خطل، الحارث بن نفیل یا الحویرث بن نفیذ، مقیس بن صبابہ، ہبار بن الاسود، ہند بنت عتبہ، ابن خطل کی دو لونڈیاں اور ایک دوسری لونڈی جس کا نام سارہ تھا۔ ان میں سے عبداللہ بن خطل، مقیس بن صبابہ، الحارث بن نفیل اور دو لونڈیوں میں سے ایک کو قتل کر دیا گیا تھا، جبکہ دوسرے لوگوں کو معاف کر دیا گیا۔

باوجود اس کے کہ حق ان پر مکمل طور پر واضح ہو چکا تھا، یہ لوگ نہ صرف پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت کا انکار کرنے کے مجرم تھے، بلکہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف مسموم اور جھوٹے پروپیگنڈے کے ذریعے لوگوں کو حق قبول کرنے سے روکنے اور پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) اور مسلمانوں کے خلاف جنگ پر اکسانے کے بھی مجرم تھے۔ ان کی اشتعال انگیزیاں اس طرح جنگوں اور زندگیوں کے ضیاع کا باعث بنیں کہ مسلسل جنگیں شروع ہو گئیں۔ ان لوگوں کو قرآن مجید کے حکم کے مطابق موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، جس سے ان پر اپنے پیغمبروں کے منکرین کے سرداروں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ایک خاص قانون جاری ہو گیا[3]۔

مزید براں، بعض تاریخی واقعات سے بھی واضح ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض لوگ مسلمانوں کے خلاف بعض

---

[1] زاد المعاد، ابن قیم ۳/۴۱۱۔

[2] الطبقات الکبریٰ، ابن سعد ۲/۱۳۶۔

[3] حق کا اس درجہ میں ابلاغ کہ انکار کی گنجایش باقی نہ رہے۔ اس طرح کے منکرین کے سرداروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور انھیں حق قبول کرنے کا مزید کوئی موقع نہیں دیا گیا تھا۔

دیگر جرائم کے بھی مرتکب تھے۔ مثلاً:

مقیس بن صبابہ کو ایک مسلمان کو دھوکے سے قتل کرنے کی وجہ سے قتل کیا گیا تھا۔ وہ مدینہ گیا اور ظاہر کیا کہ اس نے اسلام قبول کرلیا ہے اور پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اپنے بھائی کے قتل کے عوض خوں بہا کی درخواست کی۔ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسے خوں بہا ادا کر دیا۔ خوں بہا لینے کے بعد مقیس بن صبابہ پہلی ہی فرصت میں اس آدمی کو قتل کرنے کے لیے لپکا جو اسے پہلے ہی خوں بہا ادا کر چکا تھا۔ اس کے بعد وہ مکہ کی طرف لوٹ آیا[۴]۔

الحارث بن نفیل یا الحویرث بن نفیذ ایک بین الاقوامی معاہدے کو توڑنے کا مجرم تھا۔ اس نے اس قافلہ پر حملہ کیا جو حضرت فاطمہ اور حضرت ام کلثوم کو مدینہ لے کر جا رہا تھا[۵]۔

عبداللہ بن خطل ایک مسلمان غلام کو دوران سفر قتل کرنے کا مجرم تھا۔ اس نے اسے صرف اس وجہ سے قتل کر دیا کہ اس نے وقت پر اس کے لیے کھانا تیار نہیں کیا تھا[۶]۔

الحارث کی طرح ہبار بن الاسود بھی ایک بین الاقوامی معاہدے کو توڑنے کا مجرم تھا۔ اس نے اس قافلے پر حملہ کر دیا جو پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی حضرت زینب (رضی اللہ عنہا) کو مدینہ لے کر جا رہا تھا۔ حملے کے نتیجے میں حضرت زینب (رضی اللہ عنہا) کجاوے سے گر پڑیں اور ایک پتھر سے جا ٹکرائیں اور نتیجۃً اپنے ہونے والے بچے کو کھو بیٹھیں۔

متون:

یہ حدیث بعض اختلافات کے ساتھ درج ذیل مقامات میں روایت کی گئی ہے:

بخاری، رقم ۱۷۴۹، ۲۸۷۹، ۴۰۳۵۔ مسلم، رقم ۱۳۵۷۔ موطا، رقم ۹۴۶۔ ابوداؤد، رقم ۲۶۸۴، ۲۶۸۵، ۴۳۵۸۔ ترمذی، رقم ۱۶۹۳۔ نسائی، رقم ۲۸۶۷، ۴۰۶۷، ۴۰۶۹۔ احمد، رقم ۱۲۸۷، ۱۲۷۰۴، ۱۲۹۵۵، ۱۳۴۳۷، ۱۳۴۶۱، ۱۳۵۴۲۔ دارمی، رقم ۱۹۳۸، ۲۴۵۶۔ ابن خزیمہ، رقم ۳۰۶۳۔ ابن حبان، رقم ۳۷۱۹، ۳۷۲۱۔ نسائی، السنن الکبریٰ، رقم ۳۵۳۰، ۳۵۳۲، ۳۸۵۰، ۸۵۸۴۔ بیہقی، رقم ۹۶۲۱، ۱۲۶۳۳، ۱۳۰۵۶، ۱۳۱۵۱، ۱۶۲۰۶، ۱۶۲۳۹،

۴؎ البدایۃ والنہایہ، ابن کثیر ۴/ ۲۹۹۔

۵؎ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۵/ ۶۹-۷۲۔

۶؎ بیہقی، رقم ۱۶۶۵۷۔

۱۶۶۵۵-۱۶۶۵۷، ۱۸۰۵۹-۱۸۰۶۰، ۱۸۵۶۰-۱۸۵۶۲۔ ابویعلیٰ، رقم ۷۵۷، ۳۵۳۹-۳۵۴۲۔ ابن ابی شیبہ، رقم ۳۶۹۱۳-۳۶۹۱۴۔

علاوہ ازیں، اوپر متن میں دیے گئے الفاظ نسائی، رقم ۴۰۶۷ میں روایت کیے گئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً بیہقی، رقم ۱۸۵۶۲ میں 'أقتلوھم وإن وجدتموھم بأستار الکعبة' (انھیں قتل کر دو، اگرچہ تم انھیں کعبہ کے پردوں کے ساتھ بھی چمٹے ہوئے پاؤ) کے الفاظ مختلف روایت کیے گئے ہیں۔ مثلاً 'أربعة لا أومنھم في حل ولا في حرم' (چار آدمی ایسے ہیں جن کو میں نہ حرم میں امان دوں گا نہ حرم کے باہر)۔

بعض روایات، مثلاً بیہقی، رقم ۱۸۵۶۲ میں عکرمہ بن ابی جہل کا نام محذوف ہے اور اس کی جگہ 'الحویرث بن معبد' مذکور ہے، جبکہ بیہقی، رقم ۱۸۰۵۹ میں عکرمہ کے بجائے نَفِیذ یا ابن نُفَیذ آیا ہے۔ بیہقی، رقم ۱۸۰۶۰ میں اس کا نام الحارث بن نَفِیذ یا الحارث بن نُفَیذ آیا ہے، جبکہ ''زاد المعاد'' ۳/ ۴۱۱ میں اس کا نام الحارث بن نُفیل بیان کیا گیا ہے۔ بیہقی، رقم ۱۸۵۶۲ میں عبداللہ بن خطل کا نام ہلال بن خطل بھی بیان کیا گیا ہے، جیسا کہ ''الطبقات الکبریٰ'' ۲/ ۱۳۶ میں عبداللہ بن ہلال بن خطل اور ''اخبار مکہ'' ۵/ ۲۲۰ میں عبدالعزیز بن خطل اور ''زاد المعاد'' ۳/ ۴۱۱ میں عبدالعزیٰ بن خطل بیان کیا گیا ہے۔ بعض مقامات، مثلاً ''السیرۃ النبویہ'' ۵/ ۶۹-۷۲ میں مقیس بن صبابہ کا نام مقیس بن حبابہ روایت کیا گیا ہے۔

'وقینتان کانتا لمقیس تغنیان بھجاء رسول اللّٰہ' (اور مقیس کی دو لونڈیاں جو پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف ہجویہ گیت گاتی (اور لکھتی) تھیں) کے الفاظ بیہقی، رقم ۱۸۵۶۲ میں روایت کیے گئے ہیں۔ ابن تیمیہ نے اپنی کتاب ''الصارم المسلول'' ۲/ ۲۵۱ میں ان لونڈیوں کے نام فرتنی اور قریبہ یا ارنب بیان کیے ہیں۔ بعض تاریخی روایات، مثلاً ''زاد المعاد'' ۳/ ۴۱۱ میں بیان کیا گیا ہے کہ ان لونڈیوں کا تعلق عبداللہ بن خطل کے ساتھ ہے۔

بعض روایات، مثلاً بیہقی، رقم ۱۸۰۶۰ میں مذکور ہے کہ دو لونڈیاں مقیس کی نہیں تھیں، بلکہ ابن خطل کی تھیں۔

بعض روایات، مثلاً بیہقی، رقم ۱۸۵۶۲ میں مذکور ہے کہ الحویرث بن معبد، جو کہ اوپر دیے گئے متن میں بھی مذکور نہیں، کو حضرت علی (رضی اللہ عنہ) نے قتل کیا تھا، جبکہ بیہقی، رقم ۱۸۰۵۹ میں ہے کہ حضرت علی (رضی اللہ عنہ) نے ابن نَفِیذ یا ابن نُفَیذ کو قتل کیا تھا۔

ابوداؤد، رقم ۲۶۸۵ کے مطابق، یہ حضرت ابو برزہ اسلمی تھے جنھوں نے ابن خطل کو قتل کیا تھا، جبکہ بیہقی، رقم ۱۸۵۶۲ کے مطابق ابن خطل، جس کا نام ہلال بن خطل بھی ہے، کو حضرت زبیر بن عوام (رضی اللہ عنہ) نے قتل کیا تھا۔

بعض روایات، مثلاً بیہقی، رقم ۱۸۵۶۲ میں مذکور ہے کہ مقیس کو اس کے چچا زاد بھائی نمیلہ نے قتل کیا تھا۔

بعض روایات، مثلاً بیہقی، رقم ۱۸۵۶۲ کے مطابق عبداللہ بن ابی سرح حضرت عثمان کا رضاعی بھائی تھا۔

دو لونڈیوں کے حکم کے متعلق معلومات بیہقی، رقم ۱۸۵۶۲ میں بیان کی گئی ہیں۔

بعض روایات، مثلاً بخاری، رقم ۴۰۳۵ میں اسی طرح کا مضمون بیان کیا گیا ہے۔ وہ درج ذیل ہے:

أن النبی دخل مکة یوم الفتح و علی رأسه المغفر فلما نزعه جاء ه رجل فقال: بن خطل متعلق بأستار الکعبة فقال: اقتله.

''بیان کیا جاتا ہے کہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) فتح کے دن مکہ میں داخل ہوئے، جبکہ آپ خود پہنے ہوئے تھے۔ جب آپ نے اسے اتارا تو ایک آدمی آپ کے پاس آیا اور کہا: ابن خطل کعبہ کے پردوں کے ساتھ چمٹا ہوا ہے۔ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: اسے قتل کر دو۔''

بعض روایات، مثلاً ابوداؤد، رقم ۴۳۵۸ میں عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کا مقدمہ اس طرح بیان کیا گیا ہے:

کان عبداللّٰه بن سعد بن أبی سرح یکتب لـرسول اللّٰه فأزله الشیطن فلحق بالکفار فـأمر به رسول اللّٰه أن یقتل یوم الفتح فاستجارله عثمان بن عفان فأجاره رسول اللّٰه.

''عبداللہ بن سعد بن ابی سرح نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کاتبین میں سے تھا۔ پھر شیطان نے اس کو دھوکے میں ڈال دیا اور وہ (دوبارہ شرک میں مبتلا ہو گیا اور) منکرین کے ساتھ مل گیا۔ فتح مکہ کے دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسے قتل کرنے کا حکم فرمایا، تاہم حضرت عثمان بن عفان (رضی اللہ عنہ) نے اس کے لیے پناہ طلب کی تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کو پناہ مرحمت فرمائی۔''

[دسمبر ۲۰۱۱ء]

''تبلیغ میں اول خطاب ان طبقات سے ہونا چاہیے جن کے افکار ونظریات کی قیادت میں سوسائٹی کا نظام چل رہا ہو۔ یہی لوگ دراصل کسی قوم کو بناتے یا بگاڑتے ہیں۔ اگر یہ راہ راست پر آ جائیں تو سارا نظام آپ سے آپ راہ راست پر آ جاتا ہے۔ اور اگر یہ بگڑے ہوئے رہیں تو اولاً تو نیچے کے طبقات میں کوئی اصلاح واقع ہوتی ہی نہیں اور اگر ہوتی بھی ہے تو وہ بالکل عارضی ہوتی ہے۔ ان کا منفعل مزاج بہت جلد ان خرابیوں کو پھر قبول کر لیتا ہے جن کا دباؤ اوپر کے مؤثر اور عامل طبقہ کی طرف سے پڑتا ہے۔ اس کی مثال بالکل قلب اور اعضا و جوارح کی ہے۔ اگر قلب کی اصلاح ہو جائے تو سارا جسم خود بخود تندرست ہو جاتا ہے اور اگر دل میں بیماری موجود ہے تو اعضا و جوارح پر روغن کی مالش اور ضماد سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔'' (''دعوت دین اور اس کا طریقۂ کار'' از مولانا امین احسن اصلاحی ۲۳-۲۴)

''اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارے تعلق کی سب سے پہلی بنیاد شکر ہے۔ شکر کا تعلق دل سے بھی ہے، زبان سے بھی ہے اور عمل سے بھی ہے۔ دل کا شکر یہ ہے کہ آدمی کا دل اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمتوں، اس کے بے نہایت احسانات اور اس کے ان گنت انعامات کے احساس و اعتراف کے جذبہ سے اس طرح لبریز رہے جس طرح ایک دودھیل بکری کا تھن دودھ سے لبریز رہتا ہے۔ یہ تمثیل ہم نے محض تمثیل کے مقصد سے نہیں اختیار کی ہے، بلکہ لفظ شکر کی لغوی حقیقت بھی کچھ اس سے ملتی جلتی ہے۔ دل جب اللہ تعالیٰ کی احسان مندی کے جذبات سے لبریز رہتا ہے تو جس طرح ذرا سی حرکت سے ایک لبریز ساغر چھلک جایا کرتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ہر چھوٹی یا بڑی نعمت کی یاد اور اس کے مشاہدہ سے بندے کی زبان سے شکر کا کوئی کلمہ چھلک پڑتا ہے۔'' (''تزکیۂ نفس'' از مولانا امین احسن اصلاحی ۲/۳۲)

رضوان اللہ

’’والتی یاتین الفاحشة من نسائکم‘‘

قرآن مجید پروردگار عالم کی وہ کتاب ہے جو آخری آسمانی ہدایت کی حیثیت سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اور پھر سب کے سامنے بے کم وکاست پیش کر دی گئی۔حق کے متلاشی گویا اسی کے منتظر تھے۔ جب اس کی آواز ان کے کانوں میں پڑی تو انھوں نے اسے اجنبی خیال نہ کیا، بلکہ اپنے ہی باطن کی بازگشت جانا، منادی ہو جانے پر دیوانہ وار اس کی طرف گئے اور دوسروں سے بڑھ کر اسے قبول کر لیا۔اور جب اسے خدا کی کتاب مان لیا تو یہ ماننا محض عقیدت کا ماننا نہیں ہوا، بلکہ پورے دل سے اور پوری جان سے اسے مانا۔ جو کچھ بھی اس نے کہا تہ دل سے سنا،جن رموز کی طرف اشارہ کر دیا سمجھنے کی خوب خوب کوششیں کیں اور جدھر بھی لے جانا چاہا اسی کو اپنی راہ اور پھر اسے ہی اپنی منزل جانا۔کتاب اللہ کو ماننے والوں کی یہ اس درجہ وفاداری، زمانوں میں بھی قید نہیں تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اولین ساتھیوں ہی تک محدود ہو کر رہ جاتی، بلکہ بعد کے زمانوں میں بھی ایسے نفوس تسلسل سے پیدا ہوتے رہے، جنھوں نے اس کتاب کے ساتھ ایفاے عہد کی بے نظیر مثالیں رقم کیں۔ خود اس کا فہم حاصل کیا اور پھر اسے دوسروں تک پہنچانے کے لیے جو بن پڑا، وہ سب کیا۔ رخصت میں پناہ ڈھونڈنا تو دور کی بات، رخصت کو رخصت ہی پر سمجھا اور ہمیشہ عزیمت بھری راہوں کا انتخاب کیا۔آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی چکاچوند سے اپنی آنکھیں بند رکھیں اور اپنی جانوں پر بھی وہ وہ مصائب جھیلے کہ بس جانوں ہی پر کھیل گئے۔

فہم قرآن کے اس عمل میں فکر ونظر کا اختلاف ہو جانا قدرتی امر تھا، اس لیے یہ اختلاف ہو بھی گیا اور اس کی بنیاد پر آرا بھی مختلف ہو گئیں، مگر مثبت بات یہ ہوئی کہ دوسروں کی آرا کو بڑے ہی تحمل سے سنا گیا، دلائل پر سچے دل سے غور ہوا، اور اس کے بعد اگر استدلال کی کمزوری واضح ہو گئی تو بنا جھجک کے دوسرے کے موقف کو مان بھی لیا گیا۔ اس

فطری اختلاف کو اگر چہ کچھ کے ہاں افتراق بھی خیال کر لیا گیا اور پھر جنگ و جدل کی نوبت بھی آ گئی، تاہم یہ بھی ایک سچائی ہے کہ امت کے مجموعی شعور نے انانیت اور عصبیت کے کسی بھی آسیب سے اپنا دامن بچائے رکھا اور اس طرح علم و تحقیق کی صحت مند روایت کو ہمیشہ برقرار رکھا۔

آج کا ہمارا فکری جمود جو حد درجہ متعفّن بھی ہو چکا ہے، اس میں ارتعاش پیدا کرنے کی واحد صورت بھی یہی ہے کہ علم و تحقیق کی اس شان دار روایت کو پھر سے اپنا لیا جائے۔ ایک عالم اگر تحقیق کرے تو دوسرا تنقید کرے، اور جو بات بھی کھل جائے اسے دونوں ہی تسلیم کر لیں۔ اس سارے عمل میں ماحول اتنا خوش گوار ہو کہ ماتھے پر کوئی شکن آئے نہ ہی ناتے ٹوٹیں اور ایک دوسرے سے محبتیں بھی قائم رہ جائیں۔ زندہ خدا کی کتاب کو محض کتاب ہی نہیں، ایک زندہ کتاب سمجھا جائے اور اس کا حق حکومت اسے لوٹا دیا جائے۔ اس کی ہر آیت اور اس کا ہر ہر لفظ بحث کا موضوع بنے، ان پر کھل کر داد تحقیق دی جائے، اسی کتاب کی روشنی میں سب کے دلائل کا تجزیہ ہو اور اس طرح آزادانہ تقابل کی بند راہ پھر سے کھول دی جائے۔

ہماری یہ تحریر بھی اصل میں اسی سلسلے کی ایک کڑی اور احیاے فکر کے مساعی میں سے اپنی سی ایک کوشش ہے۔ ہم بھی چاہتے ہیں کہ امت کا فکر پھر سے عروج آشنا ہو، اس کی علمی قدریں علما کے نزدیک دوبارہ سے بار پائیں، ضد اور انانیت کے بت پاش پاش ہوں، اور سب سے اہم بات یہ کہ قرآن مجید پھر سے ہمارے مذہبی فکر میں مرکز اور محور کی حیثیت اختیار کر جائے۔

اس آزاد تحقیقی عمل کا حصہ بننے کے لیے، سر دست، ہم دو آیتوں کو موضوع بنا رہے ہیں۔ اس میں ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ قدیم اور جدید علماے تفسیر نے ان سے کیا سمجھا ہے، جو کچھ سمجھا ہے اس کے دلائل کیا ہیں اور قرآن مجید کے تناظر میں ان کی حقیقت اور پھر آخر کار ان آیات کا اصل مفہوم کیا ہے۔ وہ دو آیتیں یہ ہیں:

وَالّٰتِیۡ یَاۡتِیۡنَ الۡفَاحِشَةَ مِنۡ نِّسَآئِکُمۡ فَاسۡتَشۡہِدُوۡا عَلَیۡہِنَّ اَرۡبَعَةً مِّنۡکُمۡ فَاِنۡ شَہِدُوۡا فَاَمۡسِکُوۡہُنَّ فِی الۡبُیُوۡتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰہُنَّ الۡمَوۡتُ اَوۡ یَجۡعَلَ اللّٰہُ لَہُنَّ سَبِیۡلًا وَالَّذٰنِ یَاۡتِیٰنِہَا مِنۡکُمۡ فَاٰذُوۡہُمَا فَاِنۡ تَابَا وَاَصۡلَحَا فَاَعۡرِضُوۡا عَنۡہُمَا اِنَّ اللّٰہَ کَانَ تَوَّابًا رَّحِیۡمًا.

(النساء ۴: ۱۵-۱۶)

ان آیتوں کا اصل مفہوم اور اس میں بیان ہوئے احکام کو سمجھنے کے لیے ہم ذیل میں ان آرا کا ذکر کریں گے جو قرآن مجید کے قدیم اور جدید ماہرین علما سے منقول ہیں:

پہلی راے

قدیم دور میں عطاء، حسن بصری، عکرمہ، ابن کثیر اور زمخشری سمیت بہت سے علماے تفسیر کی راے یہ ہے کہ پہلی آیت میں زنا کے بارے میں کچھ ہدایات دی گئی ہیں اور دوسری آیت میں بھی انھی کا بیان ہوا ہے۔ فرق ہے تو صرف یہ کہ اول الذکر میں محض عورتوں کا اور ثانی الذکر میں مرد اور عورت، دونوں کا ذکر ہو گیا ہے۔ آج کے دور میں بھی بہت سے علما اسی راے کے موید ہیں۔ مولانا مودودی تفہیم القرآن میں اس کا بیان ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''ان دونوں آیتوں میں زنا کی سزا بیان کی گئی ہے۔ پہلی آیت صرف زانیہ عورتوں کے متعلق ہے اور ان کی سزا یہ ارشاد ہوئی ہے کہ انھیں تا حکم ثانی قید رکھا جائے۔ دوسری آیت زانی مرد اور زانیہ عورت دونوں کے بارے میں ہے کہ دونوں کو اذیت دی جائے۔'' (۱/۳۳۱)

اس میں شک نہیں کہ یہ راے ان جید علما کی ہے جن کا تفسیر میں ایک خاص مقام ہے اور وہ ان علوم میں مراجع کی حیثیت رکھتے ہیں، مگر ان کے اس تبحر علمی کے باوجود، چند سوالات ان کی بیان کردہ تاویل پر پیدا ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ سوالات بھی اتنے سنجیدہ ہیں کہ قرآن مجید کا کوئی بھی طالب علم نہ تو ان سے صرف نظر کر سکتا اور نہ ہی ان کے جوابات ملے بغیر مطمئن ہو سکتا ہے۔

پہلا یہ کہ اس راے کے مطابق دونوں آیتیں ایک ہی جرم، یعنی زنا کے بارے میں حکم کا بیان ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ پہلی آیت میں جب اس کے بارے میں ہدایات دے دی گئیں اور پوری تفصیل سے دے دی گئیں تو آخر کیا وجہ ہوئی اور پہلی ہدایات میں کون سی کمی رہ گئی کہ اس حکم کو پھر سے بیان کرنا ضروری ہو گیا۔ اور پھر اس حکم کو دہرانے کی صورت یہ بھی نہیں ہے کہ اسے قرآن کے کسی اور مقام پر یا پہلی آیت سے کچھ دوری پر دہرایا گیا ہو، کیونکہ ایسا کرنے کی تو پھر بھی کوئی نہ کوئی توجیہ ہو سکتی تھی؛ یہاں تو پہلے حکم کے متصل بعد ہی اس کا اعادہ مان لیا گیا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کرنا کیا محض تکرار نہیں؟ اور الہامی کلام کی شان کیا اس سے بہت بلند نہیں کہ ہم یہ ماننے پر مجبور ہو جائیں کہ اس کے مخمل میں تکرار محض کے ٹاٹ نما پیوند بھی ہوا کرتے ہیں؟

دوسرا یہ کہ ان دونوں آیات میں اگر ایک ہی جرم کی سزا بیان ہوئی ہے تو پھر جرم کے ثبوت میں اور اس کی سزا میں اس قدر اختلاف کیوں ہے؟ پہلی آیت بیان کرتی ہے کہ اس جرم پر خود سے گواہ طلب کیے جائیں اور یہ جرم اس وقت تک ثابت ہی نہ مانا جائے جب تک چار گواہ اس کی شہادت نہ دے دیں۔ دوسری آیت کا معاملہ یہ نہیں ہے۔ اس میں بدکاری کے ارتکاب پر نہ تو خود سے گواہ طلب کرنے کا حکم ہے اور نہ ہی سزا دینے کے لیے چار شہادتوں کی کوئی

شرط ہے۔ نیز پہلی آیت جو سزا تجویز کرتی ہے وہ اتنی سخت ہے کہ اس میں کسی عذر بیانی کا موقع ہے اور نہ ہی معافی اور تلافی کی کوئی گنجایش۔ یہ وہ سزا ہے جسے مجرم کو بہرصورت، موت کے وقت تک بھگتنا ہے، الاّ یہ کہ خدا ہی کی طرف سے کوئی دوسرا حکم جاری کر دیا جائے۔ اس کے مقابل میں دوسری آیت میں مذکور سزا صرف اذیت دینے، یعنی مار پیٹ کرنے، سخت سست کہنے اور ان کی تذلیل کر دینے ہی تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر دونوں آیتیں ایک ہی جرم کی سزا کا بیان ہیں تو جرم کے ثبوت اور اس کی سزا میں، اس قدر اختلاف آ جانے کی وجہ کیا ہے؟

تیسرا یہ کہ موخر الذکر آیت میں 'وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِھَا مِنْکُمْ' کہہ کر مرد اور عورت دونوں کا ذکر کیا گیا ہے، اور یہ صحیح بھی ہے کہ بدکاری کے فعل کا ارتکاب یہ دونوں مل کر ہی کرتے ہیں؛ مگر غور طلب نکتہ یہ ہے کہ 'وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَۃَ مِنْ نِّسَآئِکُمْ' میں مرد اور عورت کا نہیں، صرف عورتوں کا ذکر ہوا ہے کہ جن کا خود سے بدکاری کر لینا ممکن ہی نہیں ہے۔ ظاہر ہے، اسلوب میں یہ تبدیلی بغیر کسی وجہ کے نہیں ہوئی، ضرور اس میں کوئی نہ کوئی معنی پوشیدہ ہے۔ مذکورہ راے پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلوب میں اس قدر واضح تبدیلی کے ہوتے ہوئے آخر کس طرح مانا جا سکتا ہے کہ ان دونوں آیتوں کا مدعا اور مفہوم بالکل ایک ہے؟

دوسری راے

ابومسلم اصفہانی کے نزدیک 'وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَۃَ مِنْ نِّسَآئِکُمْ' کی آیت میں صرف عورتوں کا بیان ہوا ہے اور 'وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِھَا مِنْکُمْ' میں صرف مردوں کا۔ قرن اول میں مجاہد سے بھی یہی بات نقل ہوئی ہے۔ جدید علما میں سے رشید رضا مصری سمیت، کہ جنھوں نے اپنے استاذ کی بھی یہی راے نقل کی ہے، بہت سے علما نے اسے قبول کیا ہے۔ ان حضرات کے مطابق پہلی آیت یہ بیان کر رہی ہے کہ اگر عورتیں باہمی طور پر برائی کریں تو انھیں چار گواہیوں کے بعد انھی کے گھروں میں نظر بند کر دیا جائے، یہاں تک کہ انھیں موت آ جائے، یا پھر اللہ ان کے لیے کوئی اور راستہ پیدا کر دے۔ ابومسلم کے خیال میں چونکہ 'اَوْ یَجْعَلَ اللّٰہُ لَھُنَّ سَبِیْلًا' کے الفاظ آئے ہیں نہ کہ 'علیھن سبیلا' کے، اس لیے اس سے مراد کوئی حد اور تعزیر تو ہو نہیں سکتی، بلکہ کوئی ایسی ہی صورت ہو سکتی ہے جو ان پر نہیں، بلکہ ان کے لیے ہو۔ یعنی اللہ ان کے لیے قضاے شہوت کی کوئی سبیل پیدا کر دے کہ جس کی ایک صورت عقد نکاح بھی ہو سکتی ہے۔ ان کے مطابق دوسری آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر مرد حضرات ایک دوسرے سے بدفعلی کریں تو انھیں اذیت دی جائے۔ ہاں، اگر وہ توبہ کر لیں اور اپنی اصلاح کر لیں تو انھیں معاف کر دیا جائے۔

ابومسلم کی یہ راے بادی النظر میں انتہائی معقول اور دل لگتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یہ راے مان لی جائے تو کم سے کم ان تمام سوالات کا ایک حد تک جواب ہو جاتا ہے جو پہلی راے کے ضمن میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہاں تکرار محض کا الزام آجانے کا مسئلہ رہتا ہے اور نہ ہی ایک ہی جرم میں دو مختلف سزاؤں کا غیر معقول فیصلہ ماننے کی حاجت رہتی ہے، اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ پہلی آیت میں صرف عورتوں کا ذکر کیوں ہوا، اس بات کا بھی ایک طرح سے جواب ہو جاتا ہے۔ لیکن ذرا دقت نظر سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس تاویل کے نتیجے میں سب سوالوں کا جواب مل جانا تو درکنار، الٹا کچھ مزید سوالات بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔

پہلی راے پر یہ اعتراض ہوا تھا کہ اگر دونوں ہی آیتیں ایک ہی جرم کی سزا کا بیان ہیں تو پھر ایک ہی آیت کافی ہوتی، دوسری کی تکرار کیوں گوارا کی گئی۔ ابومسلم کی راے پر بھی یہ سوال ایک اور زاویے سے قائم رہتا ہے کہ اگر ان آیات میں عورتوں اور مردوں کی باہمی بدفعلی پر سزا بیان ہوئی ہے جو ہم جنسیت کا جرم ہونے کی وجہ سے اصل میں ایک ہی جرم ہے، تو اسے ایک ہی بار بیان کر دینا کافی کیوں نہ ہوا؟

اگر اس کے جواب میں یہ کہا جائے کہ چونکہ مرد اور عورت کی سزاؤں میں فرق کی وضاحت کرنا مدنظر تھا، اس لیے ان کو الگ الگ بیان کیا گیا تو پوچھا جائے گا کہ ایک ہی جرم میں دو طرح کی سزائیں بیان ہی کیوں ہوئیں، اور یہ وہی دوسرا سوال ہو گا جو پہلی راے پر بھی وارد ہو گیا تھا۔

تیسرا سوال یہ تھا کہ مقدم آیت میں صرف عورتوں ہی کا ذکر کیوں ہوا ہے۔ ابومسلم کی تاویل اس کا حل یہ پیش کرتی ہے کہ اس میں چونکہ عورت اور عورت کی بدفعلی کا معاملہ زیر بحث ہے، اس لیے مردوں کا اس میں ذکر کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ان کی یہ بات بہرحال، کسی حد تک معقول ہے اور اس کی بنیاد پر ان کی اصل راے بھی مانی جا سکتی ہے، مگر کچھ دوسرے وجوہ ہیں جو اسے مان لینے میں مانع ہو گئے ہیں:

پہلا یہ کہ قرآن مجید عربی مبین میں ہونے کی وجہ سے اپنے مدعا کے ابلاغ کے لیے ہمیشہ معروف الفاظ اور کچھ مخصوص اسالیب ہی استعمال کرتا ہے۔ 'اَلْفَاحِشَةَ' عربی زبان میں جس طرح کھلی بے حیائی کے لیے مستعمل اور زنا کے لیے ایک معروف لفظ ہے، اسی طرح 'اتی الفاحشة' بھی زنا کے فعل کو بیان کرنے کا ایک عمومی اسلوب ہے۔ لہٰذا، کس طرح ممکن ہے کہ آیت میں آنے والے الفاظ کو اس کے معروف معنی سے ہٹا دیا جائے اور 'اَلْفَاحِشَةَ' اور 'یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ' سے زنا اور فعل زنا کے بجائے عورتوں کی ہم جنسیت کو مراد لیا جا سکے، جیسا کہ ابومسلم کی راے ہے۔

دوسرا یہ کہ اگر بات وہی ہے جو ابومسلم کہتے ہیں تو پھر 'وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْكُمْ' کی آیت پر کوئی اعتراض نہیں

ہے کہ اس میں تثنیہ کا فعل آیا ہے جو مرد اور مرد کی بدفعلی بیان کرنے کے لیے بالکل موزوں ہے، مگر جب 'وَالّٰتِیۡ یَاۡتِیۡنَ الۡفَاحِشَۃَ مِنۡ نِّسَآئِکُمۡ' پر غور کریں تو پتا چلتا ہے کہ یہاں تثنیہ نہیں، بلکہ جمع کا صیغہ آیا ہے۔ اب ظاہر ہے، فعل کے ان صیغوں میں تثنیہ اور جمع کا فرق جو رکھا گیا ہے اس کی وجہ جو بھی ہو، بہر حال، مذکورہ تاویل میں اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔

تیسرا یہ کہ 'وَالَّذٰنِ یَاۡتِیٰنِہَا مِنۡکُمۡ' میں 'ھَا' کی ضمیر کا مرجع چونکہ اگلی آیت کا لفظ 'الۡفَاحِشَۃَ' ہے، اس لیے یہ طے ہے کہ جو معنی 'الۡفَاحِشَۃَ' کا ہے، وہی اِس کا بھی ہے۔ اُس سے مراد زنا ہے تو اِس سے بھی یہی مراد ہے، اُس کا معنی عورتوں کی باہمی بدفعلی ہے تو اِس کا معنی بھی یہی ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ 'الۡفَاحِشَۃَ' کا مطلب تو بے حیائی ہے، مگر عورتوں کے ساتھ ذکر سے وہاں وہ عورتوں کی ہم جنسیت ہوگئی اور مردوں کے ساتھ ذکر سے مردوں کی ہم جنسیت ہوگئی تو سوال کیا جائے گا کہ لفظ 'الۡفَاحِشَۃَ' کے اس استعمال کی زبان میں کیا دلیل ہے؟ مزید یہ کہ 'الۡفَاحِشَۃَ' کا لفظ مرد و زن کے ساتھ آ کر ہم جنسیت کے بجاے اپنے معروف معنی کے مطابق آخر زنا ہی کیوں نہ ہو گیا؟

چوتھا یہ کہ اگر ابو مسلم کی راے صحیح ہوتی تو جس طرح پہلی آیت میں 'مِنۡ نِّسَآئِکُمۡ' کے الفاظ آئے ہیں جو واضح کر دیتے ہیں کہ اس میں صرف عورتوں کا بیان ہے، بعد والی آیت میں بھی 'مِنۡکُمۡ' کے بجاے 'من رجالکم' کے الفاظ ہی زیادہ موزوں ہوتے، جو اس مدعا پر بالکل واضح ہو جاتے کہ اس میں صرف مردوں کا بیان ہے۔

پانچواں یہ کہ سابقہ راے پر جو یہ اعتراض ہوا تھا کہ وہ ایک ہی جرم میں دو مختلف سزاؤں کا ذکر کرتی ہے، وہی اعتراض اپنی مزید سنگینی کے ساتھ اس راے پر بھی وارد ہو جاتا ہے۔ یعنی اس راے میں قباحت محض یہی نہیں کہ ایک ہی جرم میں سزا مختلف ہو جاتی ہے، بلکہ دوسری قباحت یہ ہے کہ مرد اور عورت ہونے کی بنیاد پر مختلف ہو جاتی ہے۔ مرد جرم کرے تو کچھ اذیت دے دی جائے اور خلاص، مگر وہی جرم اگر عورت کر بیٹھے تو موت تک گھر میں قید کر دی جائے۔ حالانکہ مرد و زن کے مابین سزاؤں میں اس بے انصافی کی کوئی دلیل عقل میں ہے اور نہ ہی نقل میں، حتیٰ کہ خود قرآن مجید نے بھی کسی جرم کی سزا میں اس فرق کو روا نہیں رکھا ہے۔ بلکہ چوری اور زنا میں تو اس نے بات ہی اس انداز سے شروع کی ہے کہ زانی مرد ہو یا عورت، چور مرد ہو یا عورت؛ اور پھر ایک ہی جرم میں دونوں کو ایک جیسی سزا سنا دی ہے[1]۔

---

[1] لیکن اس وضاحت پر بھی اگر یہ کہہ دیا جائے کہ اس سزا میں فرق کی وجہ یہ تھی کہ عورت کو تو گھر میں بند کیا جا سکتا تھا مگر معاشی مجبوریوں کی وجہ سے مرد کو بند کر دینا چونکہ ممکن نہ تھا، اس لیے اسے کچھ اذیت دے کر آزاد کر دیا گیا؛ تو سوال پیدا ہو گا کہ

چھٹا یہ کہ ابو مسلم جب یہ بیان کرتے ہیں کہ ہم جنس عورتوں کو اس وقت تک قید رکھا جائے جب تک انھیں موت نہ آلے یا پھر اللہ تعالیٰ ان کے نکاح کی کوئی سبیل نہ پیدا کر دے، تو اس کی بنیاد ان کا یہ خیال ہے کہ آیت میں 'اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا' کے الفاظ آئے ہیں نہ کہ 'علیھن سبیلا' کے۔ اس لیے اس کا معنی لازمی طور پر یہی ہے کہ ''یا پھر اللہ ان عورتوں کے 'لیے' کوئی راستہ نکال دے۔'' یہ بات صحیح ہے کہ قرآن مجید میں کم و بیش ہر جگہ 'جعل له سبيلا' کی تعبیر اسی مفہوم کو بیان کرتی ہے، مگر اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ یہ صرف اسی معنی کے لیے آیا کرتی ہے، یہ بات صحیح نہیں ہے۔ کسی ممکنہ صورت کو بیان کرنے کے لیے بھی عربی زبان میں یہی تعبیر استعمال ہوتی ہے، چاہے وہ نئی صورت سابقہ صورت سے اپنی شدت میں کم رہ جائے یا پھر اور بڑھ جائے۔ لیکن اس استعمال سے قطع نظر، مذکورہ آیت میں بھی یہ تعبیر اپنے معروف معنی ہی کے لیے آئی ہے۔ کیونکہ دوسرا حکم نہ آ جانے تک ان عورتوں کو موت تک گھروں میں بند کر دینے کا حکم، جس طرح ان کی سزا کا بیان ہے اسی طرح ان کا معاملہ معلق ہو جانے کا بھی بیان ہے۔ چنانچہ اس شدید تر سزا اور تعلیق کے عذاب سے بچانے کے لیے جو راہ بھی بیان کی جائے گی، وہ ظاہر ہے، ان ہی کے لیے ہو گی۔

ساتواں یہ کہ اس رائے میں یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ عورتیں محض کنواری ہونے کی وجہ سے ہم جنسی کے گناہ میں ملوث ہو گئی ہیں، اس لیے اگر ان کا نکاح کر دیا جائے گا تو ان کی بری عادتیں ان سے چھوٹ جائیں گی۔ یہ دونوں ہی باتیں صحیح نہیں ہیں۔ ہم جنسیت نہ تو کنوار پن کے ساتھ مخصوص ہے اور نہ ہی شادی شدہ ہو جانا، اس کا کوئی حل ہے۔ یہ تو ایک خاص قسم کی ذہنیت ہے جو محرومی ہو یا نہ ہو، جنس زدوں کے ساتھ چمٹ کر رہ جاتی ہے۔ اور بفرض محال، اگر تسلیم کر بھی لیا جائے کہ یہ برائی تجرّد سے در آتی اور تاہّل سے چلی جاتی ہے تو پھر سوال پیدا ہو گا کہ مردوں کی ہم جنسی

اگر ایسا ہی تھا تو پھر چوری میں بھی عورت ہی کے ہاتھ کاٹ دینے کا حکم ہونا چاہیے تھا اور مرد کو کچھ دھول دھپے کے بعد چھوڑ دیا جاتا کہ اسے آخر انھی ہاتھوں سے معاشی جدوجہد کرنا تھی۔ مزید یہ کہ اگر ابو مسلم کی بات مان بھی لیں تو پھر ان سزاؤں میں جو غیر معقولیت آ جاتی ہے، اس کا جواب دینا ممکن نہیں رہتا۔ اس کے مطابق عورت کو گھر میں قید کیا جائے گا اور مرد کو باہر جانے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے گا، حالانکہ عورتوں کو ہم جنسی کے زیادہ مواقع تو میسّر ہی گھر کی چار دیواری میں ہوتے ہیں اور مردوں کو اس کے برعکس، اپنے گھر در سے باہر جا کر۔ اب وہ سزا ہی کیا ہوئی جو جرم کے مواقع ختم کر دینے یا پھر کم کر دینے کے بجائے، انھیں اور بڑھا دینے کا باعث ہو جاتی ہو۔ اور پھر ایک بات اور کہ اگر سزا میں فرق کی وجہ دنیوی مصالح ہی کو تسلیم کر لیا جائے تو کیا وجہ ہے کہ معافی اور اصلاح کے بعد مرد تو سزا سے خلاصی پا جائیں، مگر عورت سے عذر بیانی اور ذاتی اصلاح کے فوائد چھین کر اس کی سزا کو موت تک کے لیے طویل کر دیا جائے؟

کی وجہ بھی لازماً یہی رہی ہوگی، اس لیے اس کا حل بھی یہ کیوں نہ ہوا کہ انھیں اُس وقت تک مار پیٹ سے درست کیا جاتا رہتا جب تک ان کے نکاح کی بھی کوئی نہ کوئی سبیل پیدا نہ ہو جاتی۔

تیسری راے

ان آیتوں کے بارے میں ایک اور راے جس کا اشارہ رازی نے اپنی تفسیر میں کیا ہے، یہ ہے کہ پہلی آیت میں 'مِنْ نِّسَآئِکُمْ' سے مراد 'من زوجاتکم' ہے۔ یعنی اگر تمھاری بیویاں بدکاری کریں تو انھیں گواہیوں کے بعد گھروں میں بند کر دو، یہاں تک کہ انھیں موت آجائے یا پھر اللہ ان کے لیے کوئی دوسرا حکم نازل کر دے۔ اور دوسری آیت میں 'وَالَّذٰنِ' سے مراد عام مرد و عورت ہیں جو بدکاری کریں تو انھیں اذیت دی جائے، یہاں تک کہ وہ توبہ کر لیں اور اپنی اصلاح کر لیں۔

یہ راے اگرچہ ایسی تو نہیں کہ جسے معتبر علما نے قبول کیا ہو اور نہ ہی ایسی وقیع کہ اسے قبول کر لیا جا سکتا ہو، تاہم اسے آج کے دور میں بھی چونکہ پیش کیا گیا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اس پر بھی کچھ غور و خوض کر لیا جائے۔

اس راے میں اصل استشہاد 'مِنْ نِّسَآئِکُمْ' کے لفظ سے ہے، اس لیے اسی کے تناظر میں دو چیزوں کو دیکھ لینا ضروری ہے۔ یعنی 'نساء' کے لفظ کا معنی اور 'کم' کی ضمیر خطاب سے مخاطب کا تعین۔ عربی زبان میں 'نساء' کا معنی عورت ہے۔ اس کے بعد اس لفظ کا موقع استعمال ہوتا ہے کہ جس سے اس کی مراد بدل بدل جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیٹی کا ذکر کرنا ہو یا بیوی کا، یا پھر محض عورت کا؛ ان سب کے لیے یہ لفظ آجاتا ہے۔ اس کی مراد طے کرنے میں فیصلہ کن چیز اس کے ساتھ مذکور الفاظ اور رشتے ہوتے ہیں۔ جیسے قرآن مجید میں یہی لفظ مثال کے طور پر، جب مردوں کے ساتھ آیا تو عورتوں کے مفہوم میں، جب بیٹوں کے ساتھ آیا تو بیٹیوں اور جب شوہروں کے ساتھ آیا تو بیویوں کے مفہوم میں چلا گیا ہے۔ غرض یہ کہ تمھاری عورتیں، یہ الفاظ اگر شوہر کے رشتے کے ساتھ آئیں یا اُسے خطاب کر کے کہے جائیں، تب ہی اس سے بیویاں مراد لیا جانا ممکن ہوگا، وگرنہ یہ الفاظ اپنی ذات میں واضح نہیں ہیں کہ ان سے بیویاں مراد لی جا سکیں۔ اس وضاحت کے بعد جب آیت کو سیاق میں رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں شوہروں کا ذکر ہونا یا انھیں مخاطب کرنا تو کجا، دور دور تک ان کی طرف کوئی اشارہ بھی نہیں ہے۔

بہرحال، اگر سیاق میں زوج کا لفظ نہ بھی ہو تو پھر بھی 'مِنْ نِّسَآئِکُمْ' سے بیویاں مراد لینے کی ایک صورت ہو سکتی ہے۔ وہ یہ کہ کلام میں کوئی ایسا قرینہ ہو جو متعین کر دے کہ یہاں 'کم' کی ضمیر سے شوہروں ہی کو خطاب کیا گیا

ہے۔جیسا کہ 'نسائکم حرث لکم 'اور'و امھات نسائکم ' کی آیات میں چاہے شوہروں کا نام لے کر بات شروع نہیں ہوئی، مگراول الذکر میں حیض سے پرہیز اور طہر میں ملاقات کرنے کا حکم اور ثانی الذکر میں حرمت نکاح کا ذکر، یہ اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ ان مقامات پر 'نسائکم ' سے مراد بیویاں ہی ہیں۔زیر بحث آیت کا معاملہ یہ ہے کہ اس میں ان عورتوں پر جو بدکاری کریں گواہیاں طلب کرنے، اس کی بنیاد پر فیصلہ سنانے اور پھر ان پر سزا نافذ کردینے کا حکم ہے۔ یہ ساری تفصیل اس بات کا قرینہ تو ہوسکتی ہے کہ اس میں اجتماعیت کو خطاب کیا گیا ہے اور 'مِنۡ نِّسَآئِكُمۡ ' سے مراد اسی اجتماعیت میں شامل کچھ عورتیں ہیں، مگر یہ اس بات کا قرینہ ہرگز نہیں ہوسکتی کہ یہاں شوہروں کو خطاب کیا گیا ہے اور 'مِنۡ نِّسَآئِكُمۡ ' سے مراد ان کی بیویاں ہیں[2]۔

چوتھی رائے

یہ رائے سدی کی ہے، اور سابقہ رائے سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اس میں ہدایات کی تقسیم یہ کی گئی تھی کہ پہلی آیت بیویوں اور دوسری عام مرد و زن کے لیے ہے، اور اس میں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ ہونے کے اعتبار سے یہ تقسیم کی گئی ہے۔ اس کے مطابق آیات کا مفہوم یہ ہے کہ اگر شادی شدہ عورتیں زنا کریں تو انھیں ان کی موت تک گھروں میں بند کردیا جائے یا پھر اللہ ان کے لیے کوئی نیا حکم نازل کردے۔ اور اگر کنوارے مرد اور عورتیں زنا کریں تو انھیں اذیت دی جائے جو ان کی توبہ اور اصلاح کے بعد ختم کردی جائے۔

یہ رائے ایسی مدلل اور عقلی ہے کہ اس سے بہت سے سوالوں کا جواب مل جاتا ہے، لیکن اس کے باوجود، یہ اپنے اندر کچھ ایسے نقائص رکھتی ہے کہ قرآن مجید کے کسی طالب علم کا دل اس پر جم جائے، یہ ممکن نہیں رہتا۔

اولاً، یہ آیتیں قانون کا بیان ہیں، اس لیے ان کو اپنے مدعا میں بالکل واضح ہونا چاہیے۔ ان میں کسی ایسے اسلوب اور اختصار کی جو ابہام پیدا کردے، کوئی گنجایش نہیں ہے۔ اگر قرآن کو یہی بیان کرنا ہوتا کہ شادی شدہ اور کنوارے بدکاری کریں تو انھیں سزا دو، تو اس کے لیے عربی زبان میں جو معروف الفاظ مثال کے طور پر، 'محصن 'اور 'غیر محصن ' وغیرہ موجود ہیں، ان کو اختیار کیا جاتا۔ اور اگر ان اسما کو لانا موزوں نہ بھی ہوتا تو پھر افعال کو اس طرح استعمال کیا جاتا کہ ان سے ان اسما کی طرف اشارہ ہوجاتا۔ لیکن یہاں نہ تو شادی شدہ اور کنواروں کے لیے کوئی اسم

---

[2] اور اگر آیت کو سیاق سے کاٹ کر 'مِنۡ نِّسَآئِكُمۡ ' کے الفاظ سے بیویوں پر استدلال کرلینا روا ہوسکتا ہے تو پھر 'و استشھدوا شھیدین من رجالکم ' کی آیت میں 'من رجالکم ' کے الفاظ سے استدلال کرتے ہوئے یہ کہنا بھی روا ہونا چاہیے کہ جب ادھار کا معاملہ کرو تو اپنے شوہروں کو گواہ بنالیا کرو۔

آیا اور نہ ہی کوئی ایسا پیرایہ استعمال ہوا کہ بادی النظر میں ذہن ان کی طرف منتقل ہو سکے۔

ثانیاً، اگر سدی کی راے ہی صحیح ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ 'وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِکُمْ' میں 'وَالّٰتِیْ' کا اسم موصول جمع کی صورت میں آیا ہے اور 'وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِھَا مِنْکُمْ' میں 'وَالَّذٰنِ' تثنیہ کی صورت میں۔ حالانکہ عربی زبان کا قاعدہ ہے اور قرآن مجید کا بھی عام طریقہ ہے کہ اس طرح کے مواقع پر، جبکہ دو متقابل گروہوں کا ذکر ہو رہا ہو تو دونوں جگہ اسماے موصول جمع کی صورت ہی میں آیا کرتا ہے۔ مثلاً 'والذین اٰمنوا' کے بعد جب دوسرے گروہ کا ذکر ہو گا تو 'والذین کفروا' ہی کہا جائے گا نہ کہ 'والذان کفروا'۔ یہاں بھی سدی کی راے کے مطابق چونکہ دو گروہوں کا ذکر ہے: شادی شدہ عورتیں اور کنوارے مرد و زن، اس لیے ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جیسے 'وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِکُمْ' میں اسم موصول جمع کی شکل میں آیا ہے، اسی طرح 'وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِھَا مِنْکُمْ' میں بھی وہ جمع ہی کی شکل میں آتا؛ لیکن وہ 'وَالَّذٰنِ' کے تثنیہ کے صیغے میں آ گیا ہے۔ اس پر اگر یہ کہا جائے کہ 'والتی' بیاہی عورتوں کے زمرے کا بیان ہے، اس لیے جمع آیا ہے اور 'وَالَّذٰنِ' بدکاری کے دو فریقوں کا بیان ہے، اس لیے تثنیہ آ گیا ہے؛ تو سوال ہو گا کہ 'وَالَّذٰنِ' بھی تو کنوارے مرد و زن کے زمرے ہی کا بیان ہے وہ جمع کیوں نہیں آیا؟ اور اسی طرح 'وَالّٰتِیْ' بدکاری کرنے والیوں کا بیان ہے، اس لیے دوسرے فریق کی مناسبت سے وہ بھی تثنیہ کیوں نہیں آ گیا؟

ثالثاً، اگر پہلی آیت شادی شدہ عورتوں کا بیان کر رہی ہے اور دوسری آیت کنوارے مرد و زن کا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں آیتوں میں کنوارے مرد و عورت بھی آ گئے اور شادی شدہ عورتیں بھی، مگر شادی شدہ مردوں کا کیا ہوا کہ ان کی طرف اشارہ تک نہ ہوا؟ اب سدی کی راے کو جو مانیں گے ظاہر ہے، انھیں یہ بھی ماننا ہو گا کہ بیاہی عورت ہی اس گناہ پر مائل ہو سکتی یا اس وقت کے معاشرے میں اس کا ارتکاب کرتی تھی اور بیاہے مرد اس سے مکمل اجتناب کیا کرتے تھے۔ یا پھر انھیں یہ ماننا ہو گا کہ خدا کی کتاب میں بدکاری کا جو قانون ہے وہ اتنا کامل ہے کہ اس کی لپیٹ میں سبھی آ جاتے ہیں، مگر وہ اتنا ناقص بھی ضرور ہے کہ بیاہے مرد اس کی زد سے صاف بچ نکلتے ہیں۔

پانچویں راے

مولانا امین احسن اصلاحی ان آیات کو ایک اور زاویے سے دیکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہاں اصل زور 'نِسَآئِکُمْ' اور 'مِنْکُمْ' کی ضمیر مخاطب پر ہے۔ اس لحاظ سے یہ دونوں آیتیں بدکاری کی دو مختلف صورتوں کا بیان

ہوگئی ہیں۔ ''تدبر قرآن'' میں وہ اپنی راے یوں ذکر کرتے ہیں:

''ایک صورت یہ ہے کہ بدکاری کا ارتکاب کرنے والی عورت تو مسلمانوں کے معاشرے سے تعلق رکھتی ہے، لیکن اس کا شریک مرد اسلامی معاشرے کے دباؤ میں نہیں ہے ... دوسری صورت یہ ہے کہ بدکاری کے دونوں فریق مسلمانوں ہی سے تعلق رکھتے [ہیں]۔'' (۲/۲۶۵)

زنا کے ایک ہی جرم کی دو مختلف صورتوں کے بارے میں جو دو مختلف سزائیں مذکور ہوئی ہیں، ان پر چونکہ بہت سے سوالات پیدا ہو جاتے ہیں، اس لیے مولانا ان کی حکمت کسی قدر تفصیل سے واضح فرماتے ہیں:

''...دوسری صورت میں تو دونوں فریق اسلامی معاشرہ کے دباؤ میں ہیں، ان کے رویے میں جو تبدیلی ہوگی وہ سب کے سامنے ہوگی، نیز ان کے اثرات اور وسائل معلوم و معین ہیں۔ ان کے لیے بہرحال، اپنے خاندان اور قبیلے سے بے نیاز ہو کر کوئی اقدام ناممکن نہیں تو نہایت دشوار ہوگا۔ لیکن پہلی صورت میں مرد، جو اصل جرم میں شریک غالب کی حیثیت رکھتا ہے، مسلمانوں کے معاشرہ کے دباؤ سے بالکل آزاد ہے۔ نہ اس کے رویے کا کچھ پتہ نہ اس کے عزائم کا کچھ اندازہ، نہ اس کے اثرات و وسائل کے حدود معلوم و معین۔ ایسی حالت میں اگر عورت کو یہ موقع دے دیا جاتا کہ توبہ کے بعد اس سے درگزر کی جائے تو یہ بات نہایت خطرناک نتائج پیدا کر سکتی تھی۔ اول تو مرد کے رویہ کو نظر انداز کر کے عورت کی توبہ واصلاح کا صحیح اندازہ ہی ممکن نہیں ہے اور ہو بھی تو جب مرد بالکل قابو سے باہر اور مطلق العنان ہے تو اغوا، فرار، اور قتل وخون کے امکانات کسی حال میں بھی نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔ اس پہلو سے اس میں احتیاط کی شدت ملحوظ ہے۔'' (۲/۲۶۵)

مولانا کے ہاں چونکہ قرآن مجید کی زبان کا خصوصی لحاظ رکھا جاتا اور اس سے سرمو تجاوز کر لینا بھی ناجائز سمجھا جاتا ہے، اس لیے کسی کے لیے آسان نہیں ہے کہ وہ ان کی راے پر اس اعتبار سے انگلی رکھ سکے، لیکن اس کے باوجود، ان کی راے میں چند باتیں ایسی ہیں جن پر کچھ نہ کچھ کہنے کا جواز بہرحال، اب بھی موجود ہے۔ مثال کے طور پر:

اول یہ کہ اگر یہی بات کہنا مدنظر ہوتی کہ بدکاری کرنے والے مرد اور عورت اگر مسلم معاشرے کے افراد ہیں تو اُن کی سزا یہ اور یہ ہے، اور وہ عورتیں جو خود تو مسلم معاشرے کا حصہ ہیں مگر ان کے شریک گناہ مرد باہر کے ہیں، اُن کی سزا یہ اور یہ ہے؛ تو زبان کی موزونیت یہی کہتی ہے کہ پھر ان ہدایات کی ترتیب اُلٹ دی جاتی۔ پہلے مسلم معاشرے کے مرد وزن کے بارے میں عمومی حکم بیان ہوتا اور اس کے بعد اسی میں سے استدراک کرتے ہوئے اُن عورتوں کا حکم بیان کر دیا جاتا جن کے شریک گناہ مرد مسلم معاشرے کے شہری نہیں ہیں۔ قرآن مجید میں اس اسلوب کی ایک سے زیادہ مثالیں دیکھ لی جا سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر، سورۂ نساء میں جب قتل خطا کے معاملے میں دیت اور کفارے

کی ہدایات دی گئیں تو 'وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَئًا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا' کہہ کر پہلے تو اُن قاتل اور مقتول کا ذکر کیا گیا جو دونوں ہی مسلم معاشرے کا حصہ ہیں اور پھر 'فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ' کہہ کر اُس مقتول کا استدراک کر دیا گیا جو مسلمان تو ہے، مگر مسلمان معاشرے کا حصہ نہیں ہے۔

دوم یہ کہ اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ قرآن مجید میں ریاستی معاملات میں اس بنیاد پر واضح فرق کیا گیا ہے کہ کوئی شخص مسلم ریاست کا شہری ہے، یا نہیں ہے۔ مثال کے طور پر، اگر مسلم ریاست کا شہری ہے تو اسے حق ولایت دیا گیا اور اس پر سزاؤں کا نفاذ بھی کیا گیا ہے، اور اگر نہیں ہے تو اسے حق ولایت دیا گیا اور نہ ہی اس پر سزاؤں کا نفاذ کیا گیا ہے۔ لیکن قرآن مجید میں ایسی مثال شاید کوئی بھی نہ مل سکے جس میں کسی فرد کے ساتھ معاملہ محض اس لیے مختلف کیا گیا ہو کہ اس کے جرم کا ساتھی مسلم ریاست کا نہیں، کسی دوسری ریاست کا فرد ہے۔ سزاؤں میں اس طرح کی تفریق کرنے کی مذہب میں کوئی دلیل ہے اور نہ ہی عقل اور فطرت میں اس کی کوئی بنیاد ہے۔ آخر کیا فرق واقع ہو جاتا ہے اس میں کہ زنا کا فعل اپنے دو شہریوں نے کیا، یا پھر اپنے ہی ایک فرد نے باہر کے کسی فرد کے ساتھ مل کر کر لیا؟ اور اگر ایسا ہو گیا تو کیا جرم کی حقیقت بدل گئی یا مجرم کے حالات[۳] بدل گئے کہ پھر اس کے لحاظ سے ان کی سزاؤں میں بھی فرق کر دیا جانا لازم ہو گیا؟

سوم یہ کہ مولانا اصلاحی نے ان سزاؤں میں موجود فرق کی توجیہ کرتے ہوئے جن تحفظات اور اندیشوں کا ذکر کیا ہے، انھیں حقیقی مان لینا نہایت مشکل ہے۔ کسی جرم میں دو افراد کی شراکت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ اب وہ توبہ اور اصلاح کے عمل میں بھی ایک دوسرے کے شریک ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح یہ ہو سکتا ہے کہ دونوں افراد ایک ہی وقت میں تائب ہو جائیں اور وہ اپنی اصلاح بھی چاہتے ہوں، اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ ان میں سے صرف ایک اس کا خواہاں ہو، مگر دوسرا ابھی تک گناہ پر آمادہ اور اسی غلاظت میں پھر سے آلودہ ہو جانے کی کوشش کر رہا ہو۔ مولانا کی رائے پر سوال یہ ہے کہ اگر عورت بدکاری کے بعد توبہ کر لیتی اور اصلاح احوال چاہتی ہے تو اس کے اس مستحسن عمل کو ٹھکرا دینے کے لیے کیا یہ وجہ کافی ہو سکتی ہے کہ مرد اس کے جرم میں تو شریک تھا، مگر اب اس

۳؎ مجرم کے حالات کی تبدیلی کا دعویٰ ایک صورت میں کیا جا سکتا تھا جب یہ مان لیا جاتا کہ زنا کا یہ جرم مسلم ریاست کے حدود سے باہر ہوا ہے۔ لیکن یہاں اس بات کو مان لینا، اس لیے ممکن نہیں ہے کہ آیت میں زنا کے جرم پر باقاعدہ سزا دینے کا ذکر ہے جو ظاہر ہے اسی جرم پر دی جا سکتی ہے جو مسلم ریاست کے حدود میں ہوا ہو۔

کی توبہ میں شریک نہیں ہے؟ یا وہ دیارِ غیر میں ہے اس لیے اس کی توبہ کا اندازہ کر لینا ممکن نہیں ہے؟ یا یہ کہا جائے کہ جب بھی موقع ملا یہ بھاگ کھڑی ہوگی اور اس سوء ظن کی دلیل ہو تو بس یہ ہو کہ مرد اس ریاست کا نہیں، کسی دوسری ریاست کا شہری ہے؟ نیز مولانا کا یہ فرمانا بھی کچھ قابل فہم نہیں ہے کہ عورت کو اس لیے قید کیا جائے گا کہ مرد مسلم ریاست کے دباؤ میں نہیں اور اس کے عزائم بھی کچھ ٹھیک نہیں ہیں، اور ہوسکتا ہے وہ اسے اغوا یا پھر قتل تک کر گزرے۔ واضح سی بات ہے کہ عورت کو گھر میں بند کر دینے کا یہ حکم، اُس کے لیے ایک سزا ہے نہ کہ اس کی حفاظت کے لیے اٹھایا ہوا کوئی قدم، جیسا کہ آیت میں گواہوں کو طلب کرنے کی ہدایت خود بتا رہی ہے۔ لیکن فرض کر لیجیے کہ قید کر دینے کی یہ ہدایت اسی لیے ہوئی ہے کہ عورت کو مرد کے پر خطر عزائم سے بچا لیا جائے، تو پھر یہ ضرور مان لیا جائے کہ یہ ایسی ہی حکمت عملی ہے جیسے جنگل کے بے قابو درندے کی خون آشامی سن کر تمام بستی والوں کو اٹھا کر پنجروں میں ڈال دیا جائے۔

چہارم یہ کہ اگر بر سبیل تنزل، ایک ہی جرم کی سزاؤں میں فرق کرنا ناگزیر بھی سمجھ لیا جائے تو پھر بھی ان کا اطلاق کم سے کم یہ نہیں ہونا چاہیے جو مولانا کی تاویل میں ہے، بلکہ حالات کی رعایت رکھتے ہوئے یہ سزائیں موجودہ ترتیب کے برعکس ہونی چاہییں۔ یعنی قید کی سزا اس عورت کو نہ دی جائے جس نے دوسری ریاست کے مرد کے ساتھ بدکاری کی ہے، بلکہ یہ سزا اسے دی جائے جس نے اپنی ہی ریاست کے مرد سے یہ فعل بد کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس مرد نے ہزار حیلے کیے اور دیارِ غیر سے آیا، یہاں اجنبی کی حیثیت اور بے کسی کی حالت میں گناہ کیا اور پھر ایسا چلتا بنا کہ معلوم نہیں کہ لوٹ کر آنے کا موقع اسے پھر سے میسر ہوتا ہے یا نہیں، اس کے ساتھ ملوث عورت کا معاملہ اتنا حساس نہیں کہ اسے قید کر دیا جائے؛ بلکہ کچھ اذیت دی جائے اور بعد از توبہ فارغ کر دیا جائے۔ لیکن اس کے مقابل میں وہ مرد جو اپنے ہی دیار کا باسی، گھر در سے واقف اور یہاں کی ہر پر فتن راہ سے آشنا ہے، اس کے پاس ملاقات کے سو بہانے اور دوبارہ سے گناہ کر گزرنے کے ہزار راستے ہیں، اس کے ساتھ ملوث عورت کا معاملہ اتنا حساس ضرور ہے کہ اسے اذیت دے کر چھوڑ نہ دیا جائے کہ وہ کھل کھیلتی پھرے؛ بلکہ گناہ کے مواقع ختم کیے جائیں اور اسے وقت موت تک گھر میں قید کر دیا جائے۔

پنجم یہ کہ اگر ایک ہی جرم میں مختلف سزاؤں کا ہونا کسی حقیقی حکمت ہی پر مبنی تھا تو کیا وجہ ہوئی کہ مولانا کی رائے کے مطابق جب ان ہدایات کی جگہ دوسری ہدایات نازل ہوگئیں تو اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھا گیا اور ہر دو صورت میں سو کوڑوں کی ایک ہی سزا نافذ کر دی گئی؟ پھر تو ہونا یہ چاہیے تھا کہ ناسخ ہدایات میں بھی منسوخ ہدایات ہی کی طرح

سزاؤں میں واضح فرق ہوتا، اور عورت کی قید کی سزا تو بہرصورت، بحال ہی رکھی جاتی کہ ابھی تک اس کا شریک گناہ مرد نہ تو مسلم ریاست کے دباؤ میں آیا ہے اور نہ ہی اس کے عزائم شریفانہ ہو چکے ہیں۔

چھٹی راے

ان آیات کے بارے میں جناب جاوید احمد غامدی کی راے یہ ہے کہ 'وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِکُمْ' کی آیت میں دراصل ان عورتوں کا بیان ہوا ہے جو قحبہ گری کرتی ہیں، اور 'وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْکُمْ' میں زنا کے ان عام مجرموں کا ذکر ہے جو بالعموم یاری آشنائی کے نتیجے میں اس جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔

ہمارے نزدیک اب تک جو آرا بھی بیان ہوئی ہیں، ان میں سے یہ راے زبان و بیان کے اصولوں سے موافق، قرآن مجید کے الفاظ سے قریب تر، اس کے ربط میں گتھی ہوئی، عقل کی میزان پر پوری، فطرت کے داعیات سے ہم آہنگ اور انسانی تجربے کی عکاس راے ہے۔ اس راے کی تائید میں جو دلائل غامدی صاحب نے ''البیان'' میں تحریر کیے ہیں اور جن کا انھوں نے ذکر نہیں کیا مگر وہ اس راے کی تائید میں پیش کیے جا سکتے ہیں، ان کی تفصیل کچھ یوں ہو سکتی ہے:

زنا کا وہ فعل جس کا ارتکاب مرد و زن باہمی رضامندی سے کرتے ہیں، اپنی حقیقت میں ایک گناہ عظیم ہے، اور اس کا گناہ ہونا ہر مذہب میں مسلم رہا ہے۔ فطرت انسانی میں اس کے بارے میں ایک طرح کا انقباض پایا جاتا اور ہر معاشرے میں اسے ننگ کی علامت اور باعث عار سمجھا جاتا رہا ہے۔ انسان کی عمومی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس فعل کے وقوع کی ہمیشہ سے دو ہی صورتیں پائی گئی ہیں: یا تو کسی مرد اور عورت، دونوں ہی نے جذبات سے مغلوب ہو کر اس کا ارتکاب کر لیا ہے، یا پھر عورت نے مرد کی ہوس پوری کرنے کے لیے کچھ فائدوں کے عوض اس کا خصوصی اہتمام کیا ہے۔ نزول قرآن کے وقت بھی زنا کی یہ دونوں صورتیں عرب معاشرے میں رائج تھیں۔ یہی وجہ ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن مجید میں ان دونوں ہی کا ذکر کیا ہے۔ مردوں کے لیے فرمایا 'محصنین غیر مسافحین و لا متخذی اخدان' ''اس شرط کے ساتھ کہ تم بھی پاک دامن رہنے والے ہو نہ بدکاری کرنے والے اور نہ چوری چھپے آشنائی کرنے والے۔'' اسی طرح عورتوں کے بارے میں فرمایا ہے 'محصنات غیر مسافحات و لا متخذات اخدان' 'اس شرط کے ساتھ کہ وہ پاک دامن رہی ہوں، بدکاری کرنے والی اور چوری چھپے آشنائی کرنے والی نہ ہوں۔

زیر بحث آیات میں بھی قرآن مجید نے زنا کی انھی دو صورتوں کے بارے میں ہدایات دی ہیں۔ 'وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا

مِنۡکُمۡ ‘میں ان مردوزن[4] کا ذکر ہے جو زنا کے عام مجرم ہیں اور بالعموم چوری چھپے اس کا ارتکاب کرتے ہیں۔اور ’وَالّٰتِیۡ یَاۡتِیۡنَ الۡفَاحِشَۃَ مِنۡ نِّسَآئِکُمۡ ‘میں ان عورتوں کا بیان ہے جو بدکاری کو اس کی سادہ صورت میں یا چھپ چھپا کر نہیں، بلکہ ایک فن کے طور پر اور گھروں پر جھنڈے لگا کر کرتی ہیں۔پہلی صورت میں مرد اور عورت چونکہ متعین ہوتے ہیں، اس لیے آیت میں ’وَالَّذٰنِ یَاۡتِیٰنِہَا ‘ کے الفاظ میں ان دونوں کا ذکر ہوا؛ مگر قحبہ گری میں چونکہ اصلاً عورت ہی زیر بحث آتی ہے، اس لیے ’وَالّٰتِیۡ یَاۡتِیۡنَ ‘میں صرف عورتوں ہی کا ذکر کیا گیا ہے۔

زنا کی یہ دونوں قسمیں ظاہر ہے، اپنے اندر ایک ہی درجے کی قباحت نہیں رکھتیں۔ایک میں یہ گناہ محض جذبات کی مغلوبیت کا نتیجہ ہوتا ہے۔دوسری میں یہ جذبات سے ماورا ہو کر باقاعدہ ایک پیشے کی صورت اختیار کر لیتا اور اس طرح معاشرے کے اخلاق باختہ ہی نہیں، پاکیزہ نفوس کے لیے بھی گناہ کا چلتا پھرتا اشتہار ہو جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اسلامی ریاست میں جب اس گناہ کو جرم کا درجہ دے دیا گیا تو اس کی سزاؤں میں اس کی نوعیت اور سنگینی کے لحاظ سے واضح فرق رکھا گیا۔زنا لذت کے حصول کے لیے تھا، اس لیے اس کی سزا، اذیت دینا مقرر کی گئی اور قحبہ گری محض لذت کے لیے نہیں دھندے کے لیے کی جاتی تھی، اس لیے ان عورتوں کو بند کر کے ان کے دھندوں کو بند کر دیا گیا؛ ہاں، اس کا ضمنی مقصد یہ بھی ہوا کہ گناہ کی دعوت کو دبا دیا جائے اور معاشرے میں اس کے متعدی ہو جانے پر روک لگا دی جائے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ان آیات میں سزاؤں کے فرق کی بنیاد مرد اور عورت کی جنس نہیں، بلکہ جرم کی نوعیت ہے۔جرم اگر اپنی ابتدائی اور سادہ صورت میں ہوا ہے تو اس کی سزا کچھ اور ہے اور اگر وہی جرم اپنی انتہائی اور پختہ صورت میں ہو گیا ہے تو اس کی سزا کچھ اور ہے۔اسی لیے جب مرد اور عورت نے ایک ہی جرم ایک ہی درجے میں کیا تو ان کی سزاؤں میں کوئی فرق نہیں ہوا اور ان دونوں کو ایک ہی سزا سنائی گئی، جیسا کہ ’وَالَّذٰنِ یَاۡتِیٰنِہَا مِنۡکُمۡ ‘ کی آیت اس پر شاہد ہے[5]۔

اس رائے کی تائید میں جو باتیں قرآن مجید کے الفاظ، اس کے سیاق اور اس کے نظائر کی روشنی میں کہی جا سکتی ہیں،

---

[4] ’وَالَّذٰنِ یَاۡتِیٰنِہَا ‘ کے مذکر کے صیغوں سے مرد اور عورت، اسی طرح مراد ہیں جیسے والدین کے مذکر کے صیغے سے والد اور والدہ دونوں ہی مراد لیے جاتے ہیں۔

[5] آج کل تو مرد بھی قحبہ گری میں ملوث ہو چکے ہیں۔اگر اُس دور میں بھی ایسے حیا باختہ مرد ہوا کرتے تو لازمی سی بات ہے کہ ان کے لیے بھی قحبہ عورتوں کے برابر ہی سزا تجویز کی جاتی۔

وہ یہ ہیں:

اول، کسی اجتماعیت کو خطاب کرتے ہوئے کہ جس کے سامنے انسانی عادات کا تجربہ اور قرآن مجید کا عرف ہو، جب یہ کہا جائے گا کہ تمھاری عورتوں میں سے جو بدکاری کرتی ہیں انھیں گھروں میں قید کر دو اور اس کے بعد الگ سے زنا کرنے والے مرد اور عورتوں کا ذکر بھی کر دیا جائے گا؛ تو اس سے لامحالہ، وہ عورتیں ہی مراد ہوں گی جو بدکاری کا پیشہ کرتی ہیں۔

دوم، قرآن مجید نے اپنے مدعا کو واضح کرنے کے لیے 'وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِکُمْ' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ 'اَلْفَاحِشَةَ' عربی زبان میں زنا کے لیے ایک معروف لفظ ہے اور 'اتی الفاحشة' زنا کے فعل کو بیان کرنے کی ایک عام تعبیر ہے۔ 'یَاْتِیْنَ' کا فعل بیان مداومت کے لیے آیا ہے۔ فعل کا مداومت کے لیے آنا، عربی زبان میں بھی شائع و ذائع ہے اور قرآن مجید نے بھی کئی جگہ اسے استعمال کیا ہے۔ مثلاً، اسی سورہ کی آیت ۵۶ میں ارشاد ہوا ہے 'کُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُھُمْ بَدَّلْنٰھُمْ جُلُوْدًا غَیْرَھَا لِیَذُوْقُوا الْعَذَابَ'۔ ''ان کی کھالیں جب پک جائیں گی، ہم اُن کی جگہ دوسری کھال پیدا کر دیں گے تاکہ وہ یہ سزا چکھتے ہی رہیں۔'' غرض یہ کہ اسم کا معروف معنی اور فعل کا یہ مخصوص استعمال، اگر سامنے رہے تو 'وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ' کا مطلب یہاں یہ نہیں ہوسکتا کہ ''وہ عورتیں جو بدکاری کریں'' یا پھر ''وہ عورتیں جو ایک دوسرے سے بدفعلی کریں''، بلکہ اس کا صحیح معنی یہی ہوگا: ''وہ عورتیں جو بدکاری کرتی رہتی ہیں۔''

سوم، آیت میں 'فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْکُمْ' کے الفاظ بھی قابل غور ہیں، بالخصوص 'فَاسْتَشْهِدُوْا' میں باب استفعال کا آنا اور پھر 'علیها' کے بجائے 'عَلَیْهِنَّ' کا آ جانا۔ ان دونوں کا حق ٹھیک ٹھیک ادا کیا جائے تو اس سے دو باتیں سامنے آتی ہیں: ایک یہ کہ ان الفاظ میں گواہ طلب کرنے کا حکم ہے۔ دوسری یہ کہ گواہی فعل زنا پر نہیں، زنا کا فعل کرنے والیوں پر ہے۔ یعنی معاملہ یہ نہیں ہے کہ جرم ہونے اور اس کی اطلاع ہو جانے کا انتظار ہوگا، بلکہ خود آگے بڑھ کر گواہوں کو بلایا جائے گا۔ اسی طرح یہ بات بھی نہیں ہے کہ گواہ اس بات کی شہادت دیں گے کہ انھوں نے خود جرم ہوتے ہوئے دیکھا ہے، بلکہ وہ صرف ان عورتوں کی شخصیت عرفی کے داغ دار ہونے کی گواہی دیں گے۔ یہ دونوں باتیں اس چیز کی واضح دلیل ہیں کہ 'وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ' میں زنا کرنے والی عام عورتیں نہیں، بلکہ قحبہ عورتیں ہی مراد ہیں کہ جو اپنی اسی حیثیت سے معاشرے میں معروف ہوتی ہیں اور ان کا جرم بھی ایسا نہیں ہوتا کہ عام زنا کی طرح اسے چھپایا جا سکے۔

چہارم، مذکورہ آیات کو اس کے سیاق میں رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جہاں دوسری آیت کا اختتام 'اِنَّ اللّٰہَ کَانَ تَوَّابًا رَّحِیۡمًا' کے الفاظ سے ہوا ہے، وہیں سے توبہ کی قبولیت اور عدم قبولیت کا بیان شروع ہو جاتا ہے۔ اس میں پہلے ان کا ذکر ہے جو جذبات کی رو میں بہہ کر گناہ کر بیٹھتے مگر فوراً ہی اس پر متنبہ ہو کر خدا کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ اس کے بعد ان کا ذکر ہے کہ گناہ کرنا جن کی عادت ہے، اور وہ گناہ پر گناہ کیے جانے کا یہ عمل موت تک جاری رکھتے ہیں۔ ان دونوں گروہوں کا ذکر، غور کیا جائے تو زنا کرنے والے انھی دو گروہوں کی مناسبت سے آیا ہے جو اوپر کی آیات میں مذکور ہیں۔ یعنی، زنا کے عام مجرم جو جذبات میں بہک کر گناہ کر گزرتے ہیں، اور وہ مجرم جو اس گناہ کے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ لگاتار اس کا ارتکاب کرتے رہتے، حتیٰ کہ اسے ہی کمائی کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔

پنجم، ان آیتوں میں بیان ہوئی ہدایات عارضی نوعیت[6] کی تھیں جو بعد ازاں نازل ہونی والی ہدایات سے کالعدم قرار پا چکی ہیں۔ ان کے عارضی ہونے کی دلیل یہ ہے کہ 'اَوۡ یَجۡعَلَ اللّٰہُ لَہُنَّ سَبِیۡلًا' کے الفاظ سزا کے بیان کے بعد آئے ہیں جو لامحالہ، اس بات کا اشارہ دیتے ہیں کہ اس حکم کی جگہ ایک نیا حکم متوقع ہے۔ اور اس کے بعد قرآن مجید میں اسی جرم کے بارے میں کچھ دوسرے احکام کا آ جانا، بذات خود موجودہ احکام کے عارضی ہونے کی دلیل ہو گیا ہے۔ بہر کیف، جب نئے احکام دیے گئے تو ان میں بھی وہی فرق مد نظر رکھا گیا جو زیر بحث آیات میں بھی پایا جاتا تھا۔ یعنی زنا کے عام مجرموں کی سزا انھیں ایذا دینا تھی، اس لیے انھیں تو سو کوڑوں کی سزا ہی سنائی گئی، مگر قحبہ عورتوں کی سزا چونکہ ان سے مختلف بھی تھی اور سخت تر بھی تھی، اس لیے انھیں صرف زنا ہی کی سزا نہیں سنائی گئی، بلکہ معاشرے میں ان کے اخلاقی فساد کی وجہ سے فساد فی الارض کی سزائیں بھی انھیں سنا دی گئیں۔

---

[6] ان میں سے پہلی آیت تو واقعی منسوخ ہے۔ دوسری آیت کو بھی جمہور علما منسوخ کے دائرے ہی کی چیز سمجھتے ہیں، لیکن ہمارے نزدیک یہاں نسخ اس معروف معنی میں نہیں ہوا کہ جس میں سابق حکم کو ختم کر کے ایک نیا حکم دے دیا جاتا ہے؛ بلکہ یہاں سابق حکم ہی میں ایک طرح کا ارتقا ہو گیا ہے۔ یعنی ایذا کی ابتدائی اور مطلق صورت کو بالکل ختم کر دینے کے بجائے اسے ہی سو کوڑوں میں مقید کر کے اس کو آخری صورت میں متعین کر دیا گیا ہے۔

الطاف احمد اعظمی*

نظام سرمایہ داری اور اسلام

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

انسانی زندگی میں معیشت کو بڑی اہمیت حاصل ہے، نہ صرف انسان کی ذاتی ضرورتیں اس سے پوری ہوتی ہیں بلکہ تمدن کی ساری ہنگامہ آرائی اسی کے فیض سے ہے۔ اس لیے نہایت ضروری ہے کہ دولت کی پیدایش اور اس کی تقسیم کا کوئی ایسا طریقہ ہو جس سے نہ صرف انسان کی جائز معاشی ضرورتیں پوری ہوں بلکہ اس کی اجتماعی سرگرمیوں کے لیے بھی مناسب مواقع اور اسباب و وسائل حاصل ہوں، لیکن تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ دوسرے امور کی طرح اس معاملے میں بھی ابھی تک انسان کو وہ راہ عمل نہیں مل سکی ہے جس پر چل کر اپنی معاشی زندگی کے پیچیدہ مسائل کو اطمینان بخش طور پر حل کر سکے۔ سرمایہ اور محنت کے درمیان کشمکش کی ایک طویل تاریخ ہے، دوسرے لفظوں میں سماج میں ایک طبقہ ہمیشہ سے ایسا رہا ہے جس نے محنت کا استیصال کر کے اس کے ایک بڑے طبقے کو معاشی محرومی کے عذاب میں مبتلا کیا ہے۔

موجودہ دور میں اس استیصال کا اطلاق نظام سرمایہ داری (Capitalism) پر بخوبی ہوتا ہے، جیسا کہ آگے اس کے تاریخی پس منظر سے واضح ہو جائے گا۔ استیصال کے عیب سے پاک اگر کوئی نظام ہے تو وہ صرف اسلام کا معاشی نظام ہے جس کا تعارف اس کے بعد کرایا جائے گا۔

---

* آر زیڈ ۱۰۹ بی، فلیٹ نمبر ۲۰۴، تغلق آباد ایکسٹنشن، نئی دہلی-۱۹۔

تاریخی پس منظر

نظام سرمایہ داری کی خصوصیات کو سمجھنے کے لیے انگلستان کے سماج کا مطالعہ ضروری ہے۔ یورپ کے دوسرے ملکوں کی طرح انگلستان کا سماج بھی چار طرح کے طبقات پر مشتمل تھا، شاہی طبقہ، امرا (Lords) کا طبقہ، مذہبی طبقہ جس کا نمایندہ کلیسا تھا، اور بورژوا یعنی تاجروں کا طبقہ۔ ملک کی سیاسی اور اقتصادی قوت اول الذکر تین طبقات کے ہاتھ میں تھی، سب سے کم زور بورژوا طبقہ تھا۔ اور یہ صورت حال چودھویں صدی کے آغاز تک قائم رہی، لیکن اس کے بعد تاجر طبقہ کی قوت میں بتدریج اضافہ ہوا، یہاں تک کہ وہ بھی ایک بڑی طاقت بن گیا۔ اس طاقت کی وجہ اون کی تجارت تھی جس نے ان کی دولت کو دو چند کر دیا۔

جب اس تجارت کو موافق ماحول کی وجہ سے مزید فروغ حاصل ہوا اور تاجر طبقہ کے سیاسی اثر و رسوخ میں نمایاں اضافہ ہونے لگا تو اس سے گھبرا کر شاہی حکومت کی طرف سے اس تجارت پر کئی طرح کی قانونی پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ تاجروں نے اس زیادتی کے خلاف آواز بلند کی اور حکومت کے خلاف ہر نوع کی محاذ آرائی شروع کر دی۔ آخر الامر ۱۶۴۴ء میں تاجروں کو فتح حاصل ہوئی اور جاگیرداری اور شاہی اقتدار دونوں کا خاتمہ ہو گیا، لیکن برائے نام شاہی نظام کو باقی رکھا گیا۔

جاگیرداری اور شاہی اقتدار سے آزادی ملتے ہی تاجروں نے اپنی تجارتی سرگرمیاں تیز کر دیں اور قوانین کی مدد سے اپنی صنعت و تجارت کو فروغ دینے میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ ابھی تک کارخانوں میں ہاتھ سے کام ہوتا تھا، جس کی وجہ سے ان کی آمدنی محدود تھی، لیکن اٹھارویں صدی میں صنعتی انقلاب نے پورے معاشی منظر نامے کو بدل دیا۔ اب کارخانوں میں ہاتھوں کی جگہ مشینوں سے کام ہونے لگا اور پیداوار میں غیر معمولی اضافہ ہونے کی وجہ سے تاجروں اور صنعت کاروں کی آمدنی میں بے تحاشا اضافہ ہوا، لیکن دوسری طرف اس ایجاد نے دست کاروں کے ساتھ کسانوں کو بھی بے روزگار کر دیا، کیونکہ اب زمین داروں نے مشینوں کے ذریعے سے کاشت شروع کر دی تھی۔ اس طرح لاکھوں لوگ روزگار کی تلاش میں دیہاتوں سے شہروں کی طرف آنے لگے۔

اس صورت حال سے تاجروں اور صنعت کاروں نے خوب فائدہ اٹھایا۔ چونکہ اس وقت تک مزدوروں کے اوقات کار اور ان کی اجرتوں کے بارے میں کوئی قانون نہیں بنا تھا اور مزدوروں کی یونینوں کا بھی کوئی وجود نہیں تھا، اس لیے تاجروں نے پوری آزادی کے ساتھ ان پر ہر طرح کا ظلم و ستم کیا۔ ان سے معمولی اجرت پر سولہ سولہ اور سترہ سترہ گھنٹے کام لیا جاتا تھا۔ اس طرح مزدوروں کا استیصال کر کے تاجروں نے بے پناہ دولت کمائی اور ان کی صنعت و

تجارت کو خوب فروغ حاصل ہوا۔

اسی دور میں بہت سے مغربی ملکوں میں جمہوری نظام حکومت قائم ہوا تو اس کے اصول آزادی کا اطلاق نظام معیشت پر بھی کیا گیا اور اس طرح ایک ایسا اقتصادی نظام وجود میں آیا جس میں سرمایہ داروں کو کسی رکاوٹ کے بغیر دولت پیدا کرنے کی آزادی اور قانونی تحفظ حاصل ہو گیا۔

انفرادی ملکیت

نظام سرمایہ داری کی بنیاد انفرادی ملکیت کے تصور پر قائم ہے۔ انفرادی ملکیت کے مفہوم کو اس طرح سمجھیں کہ اس کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم میں وہ سامان آتے ہیں جن کو صارفین (Consumers) اپنی ذاتی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے استعمال کرتے ہیں، جیسے گھر، سواری اور کپڑے وغیرہ۔ دوسری قسم وہ ہے جو اصل سرمایہ (Capital goods) کہلاتا ہے، جیسے صنعتی پلانٹ، خام مال اور قابل زراعت زمین جس سے پیداوار حاصل ہوتی ہے یا اس سے ایسی چیزیں بنائی جاتی ہیں جو صارفین کے استعمال میں آتی ہیں۔ انفرادی ملکیت کی یہی شکل ذرائع پیداوار (Means of production) کہلاتی ہے۔ ان ہی ذرائع پیداوار کی انفرادی ملکیت نظام سرمایہ داری کا سنگ بنیاد ہے۔ اس قسم کی جائداد کی ملکیت کے معنی یہ ہیں کہ صاحب جائداد کو اس پر ہر طرح کے تصرف کا اختیار ہے۔ وہ قانونی طریقے سے اس کو جس طرح استعمال کرنا چاہے استعمال کرے۔ اگر وہ اپنی جائداد کسی دوسرے کو دینا چاہے تو دے سکتا ہے یا بذریعۂ وراثت دوسروں کو منتقل کر سکتا ہے۔

انفرادی ملکیت کا یہ نظام درج ذیل اصولوں پر مشتمل ہے:

ا۔ آزاد تجارت: نظام سرمایہ داری میں ذرائع پیداوار کی ملکیت کا مالک کوئی فرد بھی ہو سکتا ہے اور جماعت بھی۔ تاجروں کو اس بات کی پوری آزادی حاصل ہے کہ وہ جس میدان تجارت کو پسند کریں اس میں اپنا سرمایہ لگائیں اور اس سے آزادانہ فائدہ اٹھائیں۔ اس میں خسارہ اور غیر محدود نفع دونوں کے وہ تنہا ذمہ دار ہوتے ہیں۔ انھیں اس بات کی بھی آزادی حاصل ہے کہ وہ مارکیٹ میں اپنے مال کی فروخت کا اندازہ لگا کر زیادہ سے زیادہ یا کم سے کم مال تیار کریں۔ فیکٹری میں کام کرنے کے لیے ضرورت کے مطابق جتنے افراد کو رکھنا چاہیں رکھ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے کاروبار کی کامیابی کے لیے بائع (Seller) اور مشتری (Purchaser) اور مالک اور نوکر کے درمیان وہ جس قسم کا معاہدہ کرنا چاہیں باہمی رضامندی سے کر سکتے ہیں اور ان معاہدات کو عوامی قانون (Public Laws) کے

ذریعے سے وہ نافذ بھی کر سکتے ہیں۔

۲۔ نفع کا محرک (Profit motive): نظام سرمایہ داری میں تجارتی سرگرمیوں کی خاص وجہ ذاتی نفع کی توقع ہے۔ آدمی کے اندر حصول (Aquisition) کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے۔ اس کے اس فطری جذبے کو پیداوار کے ایک زبردست محرک کی حیثیت سے استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر نفع کا امکان غیر محدود ہے تو تاجر پیش قدمی اور خوش تدبیری کا زیادہ سے زیادہ مظاہرہ کرتا ہے، مال کی کوالٹی کو بہتر سے بہتر بناتا ہے، قیمتوں کو کم کرتا ہے اور مارکیٹ کو وسعت دیتا ہے۔ اسی طرح جہاں تجارت کی کامیابی اور نفع یقینی ہوتا ہے وہاں تاجر اپنا سرمایہ لگانے سے نہیں چوکتا، لیکن جہاں کامیابی کے امکانات تاریک ہوتے ہیں یا جس تجارت میں اس کو خسارہ اٹھانا پڑتا ہے اس سے وہ دست بردار ہو جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ نفع کا محرک ہی کامیاب تجارت کا ضامن ہے۔

۳۔ مقابلہ (Competition): تجارت میں مقابلہ ایک ایسا ذریعہ یا ترکیب ہے جو نظام سرمایہ داری میں ایک خود کار ناظم (Automatic regulator) کی حیثیت رکھتا ہے۔ آزاد مارکیٹ میں مقابلہ کرنے والی قوتوں (Competitive forces) کے باہمی عمل سے قیمتوں کے ساتھ نفع کی مقدار اور محنت کی اجرتوں میں خود بخود استحکام پیدا ہو جاتا ہے۔ کسی مخصوص تجارت کے میدان میں تاجروں کے درمیان مقابلے سے ایک طرف مارکیٹ میں قیمتوں میں گراوٹ کا رجحان پیدا ہوگا اور دوسری طرف اشیاء کی خریداری میں صارفین کے درمیان مقابلے سے قیمتوں میں چڑھاؤ واقع ہوگا۔ اس دو طرفہ عمل سے قیمتیں ایک ایسے مقام تک پہنچ کر ٹھیر جائیں گی جہاں صانع (Manufacturer) کا نفع یقینی ہو جائے۔ اسی طرح موجود روزگار (Available jobs) کے لیے مزدوروں کے درمیان مقابلہ سے اجرتوں میں کمی واقع ہوگی اور مزدوروں کی کمی سے اجرتوں میں اضافہ ہوگا۔ اس طرح محنت اور سرمایہ کی مناسب گردش عمل میں آتی ہے اور دونوں طبقوں یعنی مالک اور مزدور کو سودے بازی کی یکساں طاقت حاصل ہوتی ہے۔

۴۔ نظام اجرت (Wage system): سرمایہ داری نظام میں تاجر نفع اور نقصان دونوں کا ذمہ دار ہوتا ہے، خواہ نفع اور نقصان کی شرح کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔ اس نظام میں محنت کا شمار مشین اور خام مال کی طرح لاگت (Cost) کے زمرے میں کیا جاتا ہے۔ مزدوروں کو ایک متعین اجرت پر رکھا جاتا ہے اور یہ اجرت ہر حال میں اپنی جگہ قائم رہتی ہے، خواہ تاجر کو اپنے کام میں کتنا ہی زیادہ نفع حاصل ہو رہا ہو۔ شرح اجرت کا تعین خود مالک کرتا ہے۔ اس کا انحصار تمام تر مزدوروں کی حصول یابی (Availability) اور مالکوں کی مشترکہ سودے بازی کی اہلیت پر ہے۔

صنعت وتجارت میں جیسے جیسے ترقی ہوتی ہے، مزدور اور مالک کے درمیان تعلقات میں دوری پیدا ہونے لگتی ہے، مالک کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اجرتوں کی شرح کم سے کم ہو اور مزدور چاہتا ہے کہ اجرتوں کی شرح بڑھے تاکہ وہ اپنے معیار زندگی کو برقرار رکھ سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مزدور کی وفاداری مالک سے کہیں زیادہ اپنی یونین سے ہوتی ہے، لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اس کے مالک کی تجارت کو فروغ حاصل ہو، کیوں کہ وہی اس کا ذریعۂ معاش ہوتا ہے۔

نظام سرمایہ داری کی خوبیاں اور خامیاں

نظام سرمایہ داری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر فرد کو کسب معاش کے لیے سعی و عمل کی مکمل آزادی دیتا ہے، لیکن اس آزادی عمل کے ساتھ مطلق آزادی (Absolute freedom) کا جو تصور وابستہ ہے وہی اس کی سب سے بڑی خامی ہے۔ اس تصور آزادی کے حامی کہتے ہیں کہ معاشرہ کی ترقی اور اس کی فلاح و بہبود کا کام اسی صورت میں صحیح ڈھنگ سے انجام پا سکتا ہے جب افراد کو کسی خارجی مداخلت کے بغیر آزادانہ سعی و عمل کا موقع دیا جائے۔ یہ مداخلت نہ کسی فرد کی جانب سے ہو اور نہ ہی حکومت کی طرف سے۔ حکومت کا کام یہ نہیں کہ وہ سعی و عمل کی انفرادی آزادی میں خواہ مخواہ مداخلت کر کے پیدایش دولت کے فطری عمل میں رکاوٹ پیدا کرے۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ وہ انفرادی آزادی کی حفاظت کرے، امن وامان قائم رکھے، حقوق ملکیت کی حفاظت کے لیے قوانین وضع کرے اور جو شخص ان قوانین کی خلاف ورزی کرے اس کو سزا دے۔ دوسرے لفظوں میں حکومت کا کام صرف صناعوں اور تاجروں کی آزادی عمل کی حفاظت کرنا ہے۔

انفرادی آزادی کے اس تصور کو کسی طرح صحیح نہیں کہا جا سکتا ہے۔ چند افراد یا گروہوں کو اس بات کی آزادی کیوں کر دی جا سکتی ہے کہ وہ جس طرح چاہیں سرمایہ پیدا کریں اور جس طرح چاہیں اس کو تصرف میں لائیں یا موجود سرمائے سے کسی رکاوٹ کے بغیر مزید سرمایہ پیدا کریں۔ دوسرے لفظوں میں محنت کشوں کا استیصال کر کے اپنی تجوریاں بھرتے رہیں اور سازشوں کے ذریعے سے مصنوعی طور پر اشیاے صرف کی قیمتیں بڑھا چڑھا کر صارفین کو لوٹتے رہیں۔ یہ طرز عمل انسانیت کی گردن پر کند چھری پھیرنے کے مترادف ہے۔

نظام سرمایہ داری میں مطلق آزادی عمل کے نتیجے میں اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ معاشرہ کی تمام دولت سمٹ کر چند ہاتھوں میں جمع ہو جائے اور انسانوں کی ایک بڑی تعداد افلاس اور خستہ حالی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جائے۔

ارتکاز زر کے اسی عمل کے نتیجے میں سرمایہ داری نظام میں وقفے وقفے سے کساد بازاری (Recession) کے دورے پڑتے رہتے ہیں اور مزدوروں کی پہلے سے خستہ حال زندگی اور زیادہ خستہ ہو جاتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ نظام سرمایہ داری میں اب بہت کچھ اصلاح ہو چکی ہے اور مزدوروں کی حالت صنعتی انقلاب (Industrial revolution) کے دور کے مقابلے میں کافی بہتر ہے، لیکن اصلاح اور بہتری کا یہ عمل صرف صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ ملکوں ہی تک محدود ہے، غیر ترقی یافتہ یا نیم ترقی یافتہ (Under-developed) ملکوں میں نظام سرمایہ داری کی مذکورہ خرابیاں اب بھی موجود ہیں اور وہاں مزدوروں کی حالت ہنوز خراب و خستہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب تک انفرادی آزادی عمل کو اجتماعی فلاح و بہبود کا پابند نہیں بنایا جائے گا، نظام سرمایہ داری کی خرابیوں کی اصلاح ممکن نہیں ہے۔ ہر انسان کو یہ فطری حق ملنا چاہیے کہ وہ اپنی سعی و عمل سے جتنی دولت پیدا کر سکتا ہے پیدا کرے، لیکن اس کو اس بات کا حق نہیں ملنا چاہیے کہ وہ پیدایش دولت کے عمل میں بالکل آزاد ہو اور اس میں اضافہ کے لیے جو طریقہ مناسب خیال کرے عمل میں لائے، خواہ اس سے ہزاروں لوگوں کی زندگیاں برباد ہو جائیں۔ اسی طرح اس کو اس بات کا بھی حق نہیں ملنا چاہیے کہ وہ اپنی کمائی ہوئی دولت کو جس طرح چاہے تصرف میں لائے۔ اس کو دولت کمانے، جمع کرنے اور خرچ کرنے میں ان حدود وضوابط کا بہر حال پابند ہونا چاہیے جو اجتماعی فلاح و بہبود کے لیے ناگزیر ہیں۔

نظام سرمایہ داری کی ان ہی خرابیوں کی اصلاح کے لیے مارکس نے انفرادی ملکیت کے بجائے جو اس کی نظر میں تمام سماجی مفاسد کا سرچشمہ ہے، اجتماعی ملکیت کا نظام پیش کیا تھا، لیکن جس طرح انفرادی ملکیت کے نظام میں فرد کے حقوق کا تحفظ اس طرح کیا گیا کہ جماعت کے حقوق اور مفادات یکسر نظر انداز کر دیے گئے، اسی طرح اجتماعی ملکیت کے نظام میں فرد کے حقوق اور مفادات کو جماعت کے حقوق اور مفادات پر قربان کر دیا گیا۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعی ملکیت کے نظام نے روس میں جو الم ناک نتائج پیدا کیے ان کا اجمالی ذکر کیا جائے تا کہ انفرادی ملکیت کے ردعمل میں قائم ہونے والے نظام معیشت کی ناکامی کی وجوہات بھی معلوم ہو جائیں۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ماضی کے روس میں اجتماعی ملکیت کے نظام نے نظام سرمایہ داری کی بے قید معیشت سے پیدا ہونے والی بہت سی خرابیوں کو دور کر دیا تھا۔ جب ذرائع پیداوار پر انفرادی ملکیت ختم ہو گئی تو تجارت وصنعت کی آزادیاں خود بخود ختم ہو گئیں اور معاشی استیصال اور غیر محدود نفع اندوزی کے سارے خفیہ اور علانیہ

دروازے بھی بند ہو گئے۔ ذرائع پیداوار کے اجتماعی ملکیت میں آجانے کی وجہ سے حکومت کے لیے یہ ممکن ہو گیا کہ وہ اجتماعی منصوبہ بندی کے ذریعے سے وسائل دولت کو صحیح طور پر بروے کار لائے، قابل کار آدمیوں کو کام مہیا کر کے بے روزگاری کا خاتمہ کر سکے اور ناقابل کار آدمیوں (Handicaped) کو سوشل انشورنس اسکیم کے تحت زندگی کا سہارا فراہم کرے۔

لیکن انفرادی ملکیت کے نظام کو ختم کر کے اجتماعی ملکیت کا نظام نافذ کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس کے لیے روس کو بڑے ہی خوں چکاں مراحل سے گزرنا پڑا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ صرف اجتماعی کاشت کے نظام کو نافذ کرنے کے لیے کروڑوں کسانوں کو ناقابل بیان ظلم وستم کا تختۂ مشق بنا کر ہلاک کر دیا گیا اور لاکھوں لوگ ان مظالم سے تنگ آ کر ملک چھوڑ دینے پر مجبور ہو گئے۔ روس کے متوسط درجہ کے کسانوں پر جن کو کلک کہا جاتا تھا، اسٹالن کے دور حکومت میں جو لرزہ خیز مظالم ڈھائے گئے ان سے روسی تاریخ کا ہر طالب علم واقف ہو گا۔

روسی ماہر عمرانیات اور فلسفی پروفیسر سوروکن پٹی رم انقلاب روس میں انسانی جانوں کے اتلاف کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> ''انقلاب ۲۲-۱۹۱۸ میں براہ راست تصادم میں ۶ لاکھ افراد ہلاک ہوئے۔ گویا فی سال ایک لاکھ افراد موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ خانہ جنگی کے ہلاک شدگان اور بالواسطہ زد میں آ کر مرنے والوں کو شامل کر لیا جائے تو یہ تعداد ایک کروڑ ۵۰ لاکھ سے ایک کروڑ ۷۰ لاکھ تک پہنچتی ہے۔''

(Sorokin pitirim A., The Crisis of Our Age, E.P. Duttan & New York (1931), P.229) بحوالہ بنیادی حقوق، محمد صلاح الدین، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ۱۹۷۹، ص ۵۰

اس جانی قربانی کے علاوہ اجتماعی ملکیت کی اسکیم کو نافذ کرنے کے لیے اخلاق اور انسانیت کے مسلمہ اصولوں کو جس طرح پامال کیا گیا وہ کم افسوس ناک نہیں ہے، لیکن جس نظام کی بنیاد نفی اخلاق پر قائم ہوا اور اس کے ارباب اقتدار علانیہ کہتے ہوں کہ سیاست میں اخلاقیات کا کوئی وجود نہیں (There is no morality in politics)، ان کے نزدیک اخلاق اور انسانیت کی بربادی چنداں اہمیت نہیں رکھتی۔ جان و مال اور اخلاق وانسانیت کے قتل عام سے اگر روسی عوام کو عزت، آزادی اور امن وراحت کی دولت مل جاتی تو بھی اشک شوئی ہو جاتی، لیکن مذہب، اخلاق اور آزادی کی نعمتوں سے دست بردار ہو کر انھیں جو کچھ حاصل ہوا وہ دو وقت کی روٹی، تن ڈھانکنے کو کپڑا اور رہایش کے لیے ایک درمیانی درجے کے مکان کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔

اس بات سے انکار نہیں کہ کمیونسٹ روس میں مزدوروں کی معاشی حالت زارا کے دور حکومت کے مقابلہ میں کہیں بہتر تھی، لیکن زیادہ ترقی یافتہ ملکوں کے مزدوروں کے مقابلے میں ان کی حیثیت بہت پست تھی۔ اس وقت امریکہ، جرمنی، برطانیہ اور جاپان میں مزدوروں کو جو اجرتیں دی جاتی تھیں وہ روس کے مزدوروں کی اجرتوں سے کہیں زیادہ تھیں۔ مزید برآں، ان ممالک کے مزدور بہتر اجرتوں کے ساتھ آزادی کی نعمت سے بھی بہرہ اندوز تھے، جبکہ روس کے مزدور اس سے محروم تھے۔

[باقی]

محترمی و مکرمی قارئین......

۱۔ اشراق کے اجراء کے لیے

۲۔ اشراق نہ ملنے کی صورت میں

درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ کریں:

ishraq@javedahmadghamidi.com

محمد بلال

پیغام بیداری کی تذکیر

۱۵ر دسمبر ۱۹۹۷ء کی صبح تین بجے ہی تین برس سخت بیمار رہنے کے بعد مولانا امین احسن اصلاحی اپنے محبوب حقیقی سے جا ملے تھے۔

جب بھی دسمبر آتا ہے ہمیں اصلاحی صاحب کی یادشدت سے آنے لگتی ہے۔صورت حال یہ ہے کہ وقت کا دریا پیچھے کی طرف بہنے لگا ہے۔آنکھوں کے آگے کچھ مناظر لہرا رہے ہیں۔ پردۂ سماعت سے کچھ باتیں ٹکرا رہی ہیں۔ بصیرت کی آنکھیں خوش گوار حیرت سے دوچار ہو رہی ہیں:

اصلاحی صاحب کا مسکراتا ہوا سرخ وسفید چہرہ، ان کی سوچتی ہوئی آنکھیں، ان کے چمکتے ہوئے بال......ان کی مشکلات قرآن کی عقدہ کشائی، ان کی پیچیدہ احادیث میں واضح رہنمائی، ن کی فلسفیانہ امور میں نکتہ آفرینیاں....ان کی معنی خیز لطیف طنز، ان کی مغربی مفکرین کی حماقتوں پر چوٹیں، ان کے بے لاگ گہرے تبصرے.....ان کی سلطانی پر فائق دہقانی، ان کا اقتدار کے ایوانوں سے استغنا، ان کا شدائد ومصائف میں صبر وثبات۔

محمد علی جوہر اور سید سلیمان ندوی جیسی ہستیوں کی موجودگی میں نوجوان امین احسن تقریر کرتے ہیں۔ عطاء اللہ بخاری جیسے عظیم مقرران کی خطابت کے بارے میں کہتے ہیں: خطیب تو میں بھی ہوں، لیکن تم عالم بھی ہو خطیب بھی۔

۱۹۵۳ء: اصلاحی صاحب جیل میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کے ساتھ قید ہیں۔جیل کا عملہ مودودی صاحب کو یہ کہہ کر وہاں سے لے جاتا ہے کہ آپ ان قیدیوں کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔آپ کو سزاے موت ہوگئی ہے۔آپ کو پھانسی کی کوٹھری میں منتقل کر دیا گیا ہے۔اس کوٹھری میں لے جانے کے بعد جیل کا عملہ مودودی صاحب کو سزاے موت کے قیدی کا مخصوص لباس پہنا دیتا ہے اور ان کے اتارے ہوئے کپڑے واپس اسی جیل میں بھیج دیتا ہے، اصلاحی صاحب

فرط محبت سے ان کپڑوں کو لے کر کبھی اپنے سینے، کبھی اپنی آنکھوں اور کبھی اپنے سر پر لگاتے اور مسلسل روتے جاتے ہیں۔

۱۹۹۷ء: اصلاحی صاحب کے شاگرد محترم خالد مسعود مرحوم حج کر کے وطن لوٹے ہیں۔ ان کے پاس حاضر ہوئے اور مصافحہ کر کے بیٹھنے لگتے ہیں۔ اصلاحی صاحب، شاگرد کے لیے معانقہ کرنے کے لیے فوراً ہاتھ اٹھا دیتے ہیں کہ حاجیوں سے ملنے کا یہی دستور ہے۔

۱۹۷۵ء: اصلاحی صاحب، جناب جاوید احمد غامدی کے گھر تشریف لاتے ہیں۔ غامدی صاحب مولانا مودودی کے گھر کے بالکل سامنے مقیم ہیں۔ اصلاحی صاحب کھانا کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کے لیے صحن میں آتے ہیں تو غامدی صاحب سے پوچھتے ہیں: مودودی صاحب کا گھر یہی ہے؟ جی ہاں۔ غامدی صاحب عرض کرتے ہیں۔ پھر اصلاحی صاحب بار بار دہرا رہے ہیں:

''کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔''

اپنی تفسیر، تدبر قرآن کی تکمیل کے لیے اصلاحی صاحب ایک گاؤں میں منتقل ہو چکے ہیں۔ غامدی صاحب اپنے استاذ کو ملنے وہاں جاتے ہیں۔ رات وہیں ٹھیرتے ہیں۔ فجر سے کچھ پہلے غامدی صاحب محسوس کرتے ہیں کہ ذرا دور کوئی ہاتھ کے نل سے پانی کی بالٹی بھرتا اور پھر اسے انڈیل دیتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد اصلاحی صاحب، غامدی صاحب کی چارپائی کے پاس آتے ہیں اور فرماتے ہیں: میں نے تازہ پانی نکال دیا ہے، اٹھیے اور وضو کر لیجیے۔ غامدی صاحب کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کہیں اور کیا کریں۔

مولانا منظور احمد صاحب نعمانی انڈیا سے لاہور آتے ہیں۔ اصلاحی صاحب انھیں بتاتے ہیں کہ میری اہلیہ کہتی ہیں کہ تمھاری کتابیں تو میری سمجھ میں نہیں آتیں، لیکن مولانا نعمانی کی کتابیں میں خوب سمجھ لیتی ہوں۔ مولانا نعمانی جواب میں کہتے ہیں: مولانا، ہم اُن کے لیے لکھتے ہیں، اور آپ ہمارے لیے لکھتے ہیں۔

غیرت۔ وقار۔ خودداری۔ بے نیازی۔ صدر ایوب خان صاحب پوچھتے ہیں: مولانا کوئی خدمت بتائیے۔ اصلاحی صاحب کا جواب ہے: آپ سے جو کچھ کہنا ہوتا ہے، ''میثاق'' کے اداریوں میں کہہ دیتا ہوں، اس پر عمل کیجیے، یہی سب سے بڑی خدمت ہے۔ وزیر اعظم بھٹو صاحب پیغام بھیجتے ہیں: حکومت آپ کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہے۔ جواب دیتے ہیں: میں حکومت کے وظیفہ خواروں کو ہمیشہ ملت فروش کہتا رہا ہوں۔ کیا اب خود بھی یہی کام کروں گا؟ صدر ضیاء الحق کی طرف سے پیش کش آتی ہے۔ اصلاحی صاحب فرماتے ہیں۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے، اسے اپنی لائبریریوں تک پہنچائیے، یہی کافی ہے۔

آخری ملاقات ۔شام کا وقت ۔ ہم کچھ احباب اصلاحی صاحب کو ملنے آئے ہیں ۔ ان کے ساتھ مصافحہ کیا تو انھوں نے ہم سب کے چہرے پر ہاتھ پھیر کر اس طرح پیار کیا جس طرح ایک باپ اپنے بچے کو پیار کرتا ہے۔ حالانکہ ہم میں سے بعض افراد کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی ۔ مصافحہ کرتے تو بہت دیر تک ملنے والے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے رکھتے اور بڑی شفقت ومحبت سے اس کی طرف دیکھتے رہتے تھے۔

جنازہ اٹھنے سے قبل اصلاحی صاحب کی افسردہ صلبی اور روحانی اولاد بیٹھی انھیں یاد کر رہی ہے:

''ایک دور ختم ہو گیا''..... ''وہ ٹوٹ کر محبت کرنے والے تھے'' ..... ''اُن کے خلوص میں بہت گہرائی تھی'' ...... ''بسا اوقات وہ بچوں کی طرح معصوم لگتے تھے'' ..... ''وہ رات ۳ بجے خدا کے حضور گریہ وزاری کیا کرتے تھے'' ..... ''وہ اس قدر کمزور ہو چکے تھے کہ جسم پر گوشت نظر نہیں آتا تھا بس ہڈیاں اور جلد ہی دکھائی دیتی تھی'' ..... ''دعا کریں خدا اس چیز کو ان کے لیے کفارہ بنا دے'' ..... ''بیماری میں بھی ان کا لب ولہجہ بہت حوصلہ افزا ہوتا تھا'' ..... ''وہ جزع فزع کرنے والے آدمی نہیں تھے'' ..... ''حال پوچھیں تو بسا اوقات کہتے: بہت اچھا ہے'' ... ''وہ صبر کا پہاڑ تھے۔'' .... ''وہ ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۹۷ء میں وفات پائی ۔ ان کا کام ایک صدی پر محیط ہے۔''

مولانا امین احسن اصلاحی نے علم وعرفان کے جو گوہر نایاب تلاش کیے ہیں، وہ ہمیشہ چمکتے اور دمکتے رہیں گے۔ وقت کی گزران ان کی قدر میں اضافہ ہی کرے گی، ان کا کام ایک ایسا باغ ہے جو ہمیشہ پُر بہار ہی رہے گا۔ تعصّبات کی عمر بہت کم ہوتی ہے۔ان شاء اللہ، قوم ایک دن خواب گراں سے ضرور جاگے گی۔ مضبوط دلائل اپنی قوت منوا کر رہیں گے۔ ایک دن قوم جنگل کی اس آبشار، صحرا کے اس کنویں اور پہاڑوں کے اس چشمے سے ضرور آگاہ ہو گی ۔ جب تعصّبات میں جکڑی قوم آزاد ہو گی تو وہ امین احسن کی عظمت کو جان لے گی اور پھر وہ اس کے کام کی ''امین'' بن جائے گی۔

امین احسن ہم میں موجود نہیں مگر ان کا کام چھُپا ہوا نہیں ہے، بلکہ چھپا ہوا ہے۔ اور پکار رہا ہے:

برقِ آتش خُو نہیں فطرت میں گو ناری ہوں میں
مہرِ عالم تاب کا پیغامِ بیداری ہوں میں
تیرے مستوں میں کوئی جویائے ہشیاری بھی ہے
سونے والوں میں کسی کو ذوقِ بیداری بھی ہے؟